



نیم تاریک کرے کے اس کونے میں جہاں  
فرانسی طرز کی بڑی گھنی کھلتی تھی۔ اور وہ گھنی  
اس وقت اگرچہ بند ہی اور اس پر سفید جالی اور آہماں  
ویلوٹ کے خوبصورت پردے کرے ہوئے تھے مگر  
گرمیوں کی اس صبح نے انی روشنیاں اس طرح منہ  
زور کر رکھی تھیں کہ موئے شیشے کی گھنی، اس پر لگے  
ویلوٹ کے بھاری پردے اور لہراتی سفید میمین جالی بھی  
اس کا راستہ پوری طرح نہیں روک پا رہی تھی اور یہ

### ناولِ ط

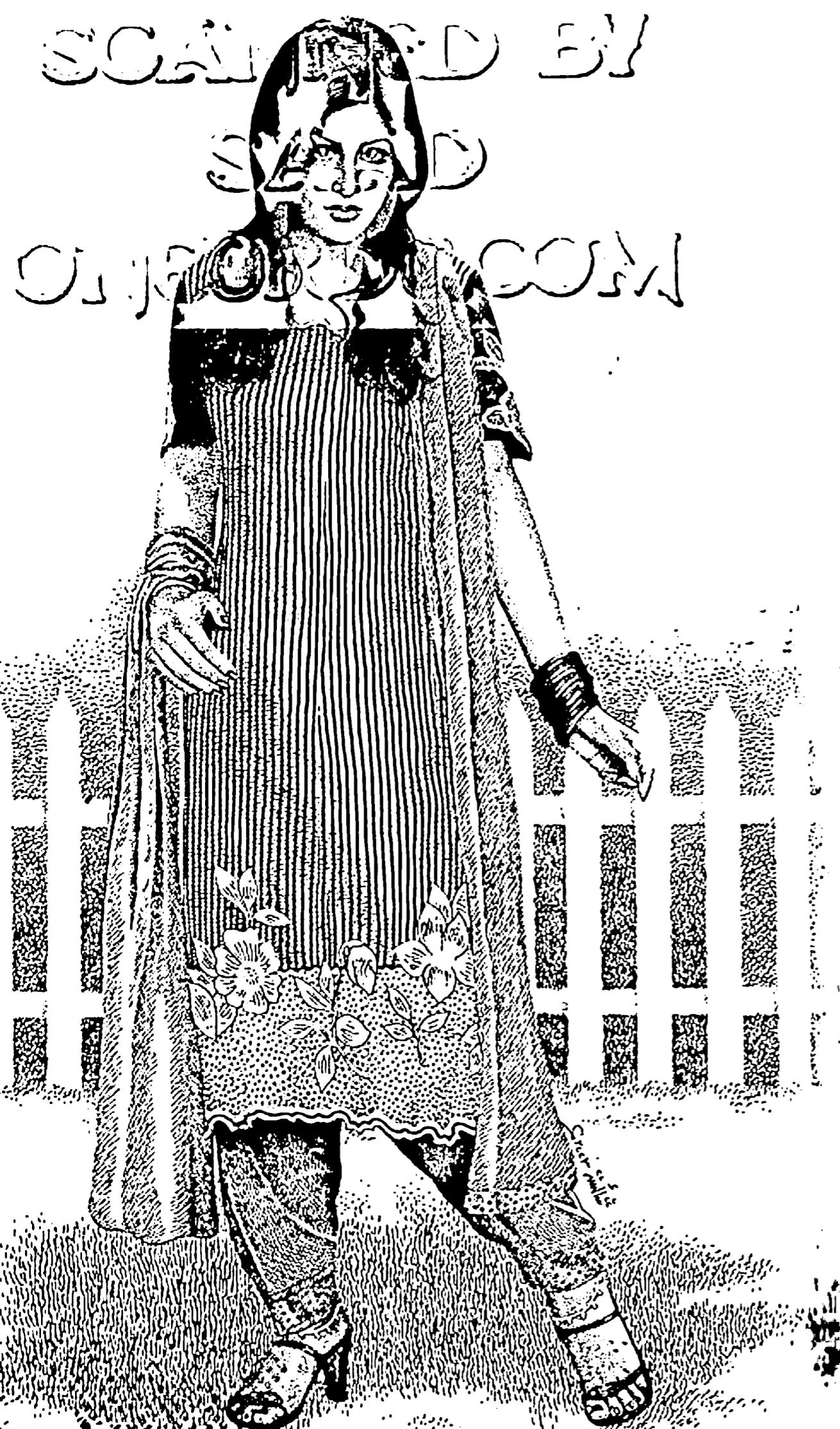
شیل پر رکھے کاک۔ توجہ کی۔ صبح کے پونے نو  
ہو رہے تھے گرمیوں کے لحاظ سے دن کب گاشروع  
ہو چکا تھا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے اٹھنے کا ارادہ کر لیا۔  
اگرچہ آج چھٹی کاروں تھا لیکن باروئے میرا ایک پیلاشر  
سے ملنائے تھا بلکہ میں نے اسے پنج پر گھر پلا رکھا تھا۔  
ست قدموں کے ساتھ میں گھنی کی جانب بیٹھا۔  
پردے کھینچے اور پورا بیڈ روم بغیر ٹوب لائٹ آن کیے  
روشن ہو گیا۔ میرے اس محترم خوبصورت گھر کے  
دوں بیڈ روم اور والے پورشن میں تھے اور اس رخ  
پہننے تھے کہ تازہ ہوا اور روشنی کا با آسمانی گزر ہو تا تھا۔  
یہ اہتمام میں نے بطور خاص اپنے شاعرانہ ذوق کو مد نظر

ہوئے کیا تھا۔

میں فریاد کر رہا تھا میں اسی رہ کر رہتا ہوئے کیا تھا۔  
لگی ہال میں ایک شاعر ہوں۔

ایک سڑاک اور اس کے ساتھ ساتھ میں ایک کثیر الائچا عت روختا ہے



ہے۔ میری بیٹی جانہل گھاس پر بیٹھی اپنا ڈرائیور کا۔ یہ توی سے ایک رومانوی شاعر، حسان ادیب، ملک کی اہل پورا کر رہی تھی۔ اس کے اوپر قرآن کھاتوں مجھے دیکھ کر نامور اہلی شخصیت کی یہ توی مجھ سے اجازت طلب نہیں کریں تھی بلکہ مجھے خبردار کرتی تھی یہ کہہ کر۔

”پاپا!“ وہ چلانی اور میرا دل دھک سے رہ گیا۔

”آئے ان بات سے قطعاً“ سروکار نہ تھا کہ اس کا اٹ گیا۔ میں اپنے پرہامند ہے یا نہیں۔ وہ سننے کی تاب بھی رکھتا ہے ماں میں۔ اسے صرف اپنی ننانے سے غرض نہیں ہوتی تھی۔

میری ہیوں یہ اس کے چڑھنے کی دھمک گونج رہی ہے، اس سے قہلے کہ وہ حملہ آور ہو، اپنی بے سروپی گفتگو کے ساتھ۔ میں واش روم میں پناہ لے لیتا ہوں۔

”دھرم۔۔۔ شاہنشاہ۔۔۔“

یہ دھرم کی آواز میرے واش روم کا دروازہ بند ہونے کی تھی اور شاہ کی زوردار آواز کے ساتھ میری یہوئی نہ دروازہ کھولا تھا۔

”مجب سنتے ہو!“

اس کی ریل گاڑی کی نصف صدی پرانی دسل جیسی آواز خالی کرے میں گونج کے رہ گئی۔ اچانک میری رانشنگ چیز کے کراہنے کی آواز آئی اور پھر مسلسل آہ دلکا کی صورت مجھ تک پہنچتی رہی۔ یقیناً ”وہ اس پہ بیٹھی گول گول چکر گھماتی جھولا جھول رہی ہوگی۔ میں نے غصے سے دانت کچکچائے مگر نیجتھا نہ تو تھ برش کا بیڑہ غرق ہو گیا جو دونوں داڑھوں کے درمیان کچلا گیا تھا۔ یہ اس میں کچھ تھا۔ پتا نہیں دانت کچکچائے سے ہلے میں یہ برش احتیاط سے نکال کیوں نہیں لیتا اور پتا نہیں، میں یہ دانت آخر کچکچائی تھی کیوں ہوں اور پتا نہیں اس نہ تو تھ برش کے بجائے میری یہوی سالم کی سالم کیوں نہیں، میرے دانت کی زد میں اُکر کچکچائی۔

اوہ یہ میں کیا اول جلوں سوچ رہا ہوں۔ سراسر غیر شاعر ان باتیں۔۔۔ نہیں، مجھے نہیں طبع رومانوی شاعر کو ایسے غیر رومانوی خیالات زنب نہیں دیتے۔ میں نے سرجھنکا۔ واش روم میں اس سے زیادہ

اسکول وین میں آتی جاتی ہے اور بننے کے پاس سائیل ہے، اس لیے اس عمر رسیدہ گاڑی کی محنت بھی بہتری رہتی ہے کیونکہ اس نر میں ہم اس سے زیادہ کام جو نہیں لیتے۔

میں نے بھروسہ انگڑائی لے کر اپنے اس پر سکون کرے کا جائزہ لیا۔ نیکوں ماحول ہمیشہ سے میری کمزوری رہا ہے۔ اپنے لیے بیڈروم سجا تے ہوئے میں نے یہی رنگ نمایاں رکھا۔ دیواروں پر ہلکا آسمانی پینٹ، دروازے اور کھڑکیاں سفید، فرش پر گمراہیا کارپیٹ اور اس سے ہمینگ پردے سفید فریچرہ نیلے رنگوں کے امتزاج والی چادریں پہنچی ہوئیں۔ یہ کہہ میرے ذوق کے عین مطابق تھا اور میری حس جمال کی تسلیم کرنا کے لیے پہلے پہل اس روزنامے نے مجھے محبت کا لکھنے کی آفردی تھی میں نے منہ مانگی قیمت پر منظور کیا۔ میرے کالم سجیدہ نوعیت کے ہوتے ہیں اور میں سیاسی موضوعات کے بجائے عام سماجی مسائل کے بارے میں حساس اور درمند دلوں کو جھنجورنے کی نیت سے لکھتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ بدلتی حکومتیں اور اپنے اپنے مزاج کے مالک اہل اقتدار میرے کام میں خلل نہ ڈال سکے۔

اس میدان میں میری کامیابی ریکھتے ہوئے اس اخبار کے ایڈیشن نے ہفتہ وار شائع ہونے والے سندے میگزین کے اہل اور سماجی صفحات کا بھی مجھے انچارج بنا دیا۔ یعنی میرارنگ اس شعبے میں بڑھتا چلا گیا۔ جس کے لیے میرے والدین جب تک حیات رہے، مجھے خوف زدہ ہی کرتے رہے کہ صرف کاغذ کا لے کر لینے سے گھر کا چوہا نہیں جلتا۔ اللہ کا شکر ہے کہ میری صلاحیت، میرافن، میرے روزگار کا بھی سبب بنا۔ زرادیری سے ہی سی گھر میں نکر معاش سے تدرے آزاد تو ہوا۔ اسی رنگ سے میں نے پیاری مرے کا گھر میں متسلط گرنی پر، ایک جامن کا اور ایک پکنار کا یہ گلاب اور موٹایا کی ہاؤسٹنگ اسکیم کیں بینیاں اُنکی کمائی کے خریدی گئی تھیں کہ بارہ سے اور سائیڈ پرے دو چار گلے اس کو لان کی سکنڈ ہند سوزوکی ایکس بھی گھر کے مختصرے رکھل دے رہے تھے ورنہ حقیقت یہ تھی کہ ان لئے ایک رکھنے کی وجہ سے اس کے چار گلے دو پیڑوں نے اتنی جگہ بھی نہ چھوڑی۔ آقس کی وین پک ایڈڈر اپ کرتی ہے۔ میری بیٹی اپنی تھی کہ اس ”لان“ میں دو بیڈ کی کربیاں بیڈ دیں۔

پورچ کے ساتھ مختصر سا احاطہ تھا جس میں لگے دو ہاؤسٹنگ اسکیم کیں بینیاں اُنکی کمائی کے خریدی گئی تھیں کہ بارہ سے اور سائیڈ پرے دو چار گلے اس کو لان کی لئے ایکس بھی گھر کے مختصرے رکھل دے رہے تھے ورنہ حقیقت یہ تھی کہ ان لئے ایک رکھنے کی وجہ سے اس کے چار گلے دو پیڑوں نے اتنی جگہ بھی نہ چھوڑی۔ آقس کی وین پک ایڈڈر اپ کرتی ہے۔ میری بیٹی اپنی تھی کہ اس ”لان“ میں دو بیڈ کی کربیاں بیڈ دیں۔

”اریں۔۔۔ رہ جان علی فلکس۔۔۔ رومانوی شاعر، نکر ہلمز دیس،“ مایہ ناز دانشور، ایک سجیدہ افسانہ۔۔۔ ہر لذت سنا چاہتا تھا، بھی بھی نہیں، ان پندرہ انل ایک بار بھی نہیں۔۔۔ لیکن وہ میری

وقت نہیں گزارا جاسکتا تھا اور وہ بھی اس کری میں۔ میں نے چھٹت کا جائزہ لیا، مختصری کھڑکی میں ایک راست فین تو لگا، ہی ہوا تھا۔ میں سمجھ دی سے میلنگ فین لوانے کے امکانات کے بارے میں غور کرنے لگا۔

”چلو، اب آجھی جاؤ۔ میں کوئی ”ولی“ تو نہیں پیشی۔ روئی پکارہی ہوں، ہائڈی سڑنہ جائے“

اس کی اربابی پہ میں باہر نکلا اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ میری باتیں وہ ایک کان سے سن کر دوسرا کان سے نکال دیں کی عادی ہے، میں ٹوکے بغیر نہ رہ سکا۔

”ہائڈی نہیں، ہندیا کہتے ہیں اور یہ ”سرٹی“ نہیں ”جل جاتی“ ہے۔ ”ابھی تو میں اسے یہ بھی بتانا چاہ رہا تھا کہ وہ ”کھانا پکانے“ کے بجائے ”روئی اپکانا“ یوں کہتی ہے کہ اس نے اپنے اصل منہ سے بھی زیادہ برا منہ بنایا۔

”سرٹی سے یا جلے۔ ایک ہی بات ہے۔ ناس تو ہو جاتی ہے۔“

”نہاس کیا ہوتا ہے، ضائع ہو جاتی ہے یا برباد ہو جاتی ہے۔“ میں اردو کی اس مرمتیہ رہنے پا تھا۔

”نہاس ہو، برباد ہو، ضائع ہو تباہ ہو،“ ایک ہی بات ہے۔ سیاپا تو میری جان کو ہے، مجھے ہی دوبارہ دخت پڑے گا۔“

اس سے پہلے کہ میں ”سیاپا“ اور ”دخت“ کے مقابل کوئی مہذب اور بھلے الفاظ اسے بتا آکہ وہ شروع ہوئی۔

”اجی سنتے ہو! آپ صغار کی پوتی (پوتی) کی کرمائی ہوئی ہے۔“

”کیا۔ کیا ہوئی ہے۔“ جہاں تک میرے علم میں تھا، میری اس رشتے کی خالہ جو خاندان میں آپا کے نام سے مشهور ہیں، کی کی پوتی کی اب تک شادی نہ ہوئی تھی پھر ان کی ”کڑی“ پسے ہوئی۔“

”ہا۔۔۔ ہائی، ہوش کو، ابھی تک سوئے ہوئے ہوئے ہوئے میں سینے بھی کا نام کریں یا لیا۔“ تباہ کی سی عینہ اسے سیاپی پوتی کی کرمائی ہوئی سے۔“

”کتنی بار کما ہے، بیٹیوں کے ہاتھ نہیں چوتے۔“

ہو گئی ہے۔

”اوھسے اچھا اچھا۔ مبارک، ہو۔“

”مجھے کس بات کی مبارک باد۔ لو بھلا، تو کون میں خواخواہ۔“ وہ بلاوجہ ناراض ہو گئی۔ میں نے کھڑکی سے آواز دے کر جاناں کو اخبار لانے کے لیے کہا۔

”بڑی آپ بی پھرتی ہیں، آپ کو بڑا شوق ہے اپنے گھر کے ہر معاملے میں اپنی خالہ کو آگے کرنے کا۔ بزرگ ہیں ہماری، بزرگ ہیں ہماری۔“ اس نے ٹیڑھامنہ گر کے میری نقل اتاری۔ میں غصے کا گھونٹ بھر کے رہ گیا۔ بے شک یہ الفاظ میں نے ضرور ادا کیے ہوں گے مگر ایسے منحوس تاثرات کے ساتھ نہیں جیسے کہ وہ کہہ رہی تھی۔

”ا نہیں شرم نہ آئی، اتنا برا فیصلہ آپوں آپ کرتے ہوئے آپ سے صلاح نہیں لے سکتے تھے۔ سارے معاملے طے کر کے یہ چار لذو پکڑا گئے ہیں۔“ اس نے موتی چور کے لذو سامنے کیے۔ میں نے اخبار کے استقبال کی خاطر عینک چڑھا لی۔

”لذو کے ساتھ چائے بھی لے آتیں۔“ میں نے احساس دلایا کہ ساڑھے نونج رہے ہیں اور میں تا حال صبح کی اس عیاشی سے محروم ہوں۔

”یا! چائے اور یہ اخبار۔“ جاناں نے گرم گرم چائے کا کپ آگے کیا تو میں سمجھ گیا کہ اسے اخبار لانے میں تاخیر کیوں ہوئی، ورنہ وہ میری ایک آواز پیک کے آجایا کرتی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے ٹپ تھاما اور اس کے ہاتھ کی پشت پہ ایک پیار بھرا بو سے دیا۔ وہ مجھ سے جڑ کے بیٹھ گئی۔ آرزو کو ہماری محبت کا یہ مظاہرہ ایک آنکھ نہ بھایا۔ یہ الگ بات کہ اس کی ایک آنکھ بھی مجھے نہ بھاتی تھی۔ (آرزو میری بیوی کا نام ہے اور اس نام پر میں نے جو دھوکے کھائے ہیں اور اس نام پر میں نے جو دھوکے کھائے ہیں اس کے نام ہے اس کی کرمائی، اس کی پوتی کی اب تک شادی نہ ہوئی تھی پھر ان کی ”کڑی“ پسے ہوئی۔)

”ہا۔۔۔ ہائی، ہوش کو، ابھی تک سوئے نہیں تو کیا گھر تھے میں سینے بھی کا نام کریں یا لیا۔“ تباہ کی سی عینہ اسے سیاپی پوتی کی کرمائی ہوئی سے۔“

”کتنی بار کما ہے، بیٹیوں کے ہاتھ نہیں چوتے۔“

ان کے ماتھے پیار کرتے ہیں کہ ”ہنس کے اعتراض کی۔“ ایک بے بنی آہ بھری تھی۔ ”جو مرضی پکاؤ،“ روزیہ جملے دہرا دہرا کے اب میں ابھی تک آگیا تھا۔

”ایوں، کالعوبند کیا۔“

”سیانے کرتے ہیں۔ بیٹی کے ماتھے پیار کرو تو اس لے افسوس اچھے ہوتے ہیں، ہاتھ پیار کرو تو ہاتھ میں اتفاق نہیں رہتا۔“ اس نے اپنی اعلیٰ رحمت جھاڑی۔ ایسے میں اس کے ہونق چرپے پہ جو خود ساختہ ”سیانے“ ہاتھ ”بچوں سے پوچھ لو۔“ وہی میرا جان پھرنا تھا۔

”بچوں سے گیا پوچھوں۔ جاناں کے گی۔ ماں میں نے ابھی اتنا برا پر اٹھا کھایا ہے، میں تورات تک کچھ کھانے والی نہیں۔ جنید کے گا۔ میرے لیے برگریا پڑا۔ میکوا دیں۔“ وہی اس کا جان نہ بخوا۔

”ا خبار پلنا۔“

”تکر کون کی کوئی ایک بزری ہے۔“

”مکدو ڈال لو یا بھندی۔“

”بگوشت اتنا منگا ہو گیا ہے، دوسروے کلو۔ ناس مارتا ہے اتنے منکے گوشت کا۔“ وہ غصب تاک ہوئی۔

”بھندی تو بندہ دیے ہی ممالہ ڈال کے بھون لے گوشت میں تو ساری لیس چھوڑ دیتی ہے اور کدو تو ابھی کل ڈال لے تھے۔“

”آلو ڈال لو، کچنار ڈال لو یا پھرا لیے ہی بھون لو۔“

”دلغ خراب ہے میرا جو اتنا منگا گوشت خالی بھون لوں۔ ایک ڈونگا بھی نہیں بنے گا۔ بزری سے دو وقت کا سالن بن جائے گا۔ آلو آج کل میٹھے آرے ہے ہیں اور

کچنار کا ب موسم کھا رہا ہے۔ جب موسم تھا تو آپ نے پکانے نہیں دی کہ پکانے کے لیے سبزیاں کم تو

نہیں جو کبھی کلیاں نوچ کر پکارہی ہو، کم از کم بچوں کو تو بخش دو۔“

”ہاں تو کیا غلط کھا تھا۔ اتنی زرم و نازک کو نہیں کو تو کیا غلط کھا تھا۔“

”کھی میں کرم مسالے اور دی کے ساتھ پکتے دیکھ کر مجھے سخت تکلف ہوتی تھی۔“

”اور کیا مجھے تکلف نہیں ہوتی تھی جب تو کیا جھر بھر کچنار اپنے درخت سے اترتی تھی اور نخلے والے چٹمارے لے لے کر کھاتے تھے۔ چالیس روپے کلو

”آج کیا پکاؤں؟“

”بس سوال سے میں پچنا چاہ رہا تھا،“ وہی اس نے

انٹے لار کھیا۔ اب ہر روز کی طرح ایک بحث شروع

۔۔۔ والی تھی جس کے سارے مندرجات سے میں

اگا تھا۔ اپنے پیش کیے گئے نکات سے بھی اور اس

۔۔۔ انتراضات سے بھی۔ اس بحث کا منطقی انجام کیا

گا۔۔۔ یہ بھی جانتا تھا لیکن اس حقیقت سے بھی بخوبی

اگا تھا کہ اس بحث سے فرار ممکن نہیں۔ میں نے

لئی ہے بازار میں اور ہم مفت کی بھی نہیں کھا سکے۔  
ہائے ہائے، آج تو آپ کا دوست بھی کھانے پے آرہا  
ہے۔ جلدی بتا میں۔ کیا پکانا ہے۔ دیر ہو رہی ہے، بھی  
بھکے اتوار بازار بھی جانا ہے۔ سیل سے لان کے  
”ٹوٹے“ (پیس) بھی چھانٹے ہیں۔

”مرغی سستی ہے، وہ بھون لو۔ ساتھ میں مالے  
والی بھنڈی۔“

”آپ کا دوست کیا کہے گا، فون کر کے روٹی پے بلایا  
اور یہ پکا کر رکھ دیا۔“

”پھر مرغی کی بربانی یا پلاو بنالو۔ ساتھ میں شامی  
کباب ایک سالم بناؤ الو۔“

”ہاں بڑا لاث صاب آرہا ہے۔ میں ہزار روپے کی  
روٹی پکاؤ الو۔“ اس نے ہاتھ چھایا۔ زوج ہو کر میں نے  
اخبار پڑھ دیا۔

”تم پکھ مت پکاؤ، کم از کم میرے یا میرے دوست  
کے لیے تو یہ گز نہیں۔ میں اسے باہر کھانا کھلادول  
گا۔“ خیری صلا، گھر کے ہوتے ہوئے ہوٹل میں کس  
لیے جانا ہے اور کتنے میں آئے گا۔“

”تم کھانا بعد میں پکانا، پلے چکن کاجوڑا لے دو۔“

اس سے گلوخلاصی حاصل کرنے کے لیے اگر پائچ  
سو یا ہزار کے نوٹ کی قربانی دینا ٹھی تو مجھے منظور تھی۔

”پلے آپ انھوں یوستی بن کے لیئے رہتے ہو۔“  
اس نے تکلیف جرأت سے ملک کے ایک عظیم مفکر  
اور دانشور کو ”پوستی“ کا خطاب دے دیا۔ میں ترپ  
کے انھوں بیٹھا۔

”چکن کاجوڑا میں آپے خرید لوں گی۔ آپ پلے کلو  
چکن خرید کے لاو۔ کیا ماد گرے، آج آپ کی باتیان  
لیتے ہیں۔ چکن پلاو بنائی ہوں، ورنہ میرا دل تو کڑھی  
کھانائی کو جاہ رہا تھا۔“ میں سنبھلنے لگی، گھوٹاں رکھاں  
تھا۔ حیرت کی سدت سے میں بے ہوش ہوتے ہوئے تھی۔  
بھا۔ ایسا اپنی بارہوا تھا، ورنہ وہ ساری کیتیاں ان کرنسیں رہتیں۔  
شاید دماغ کی گرمی تھی جو اچھا بھلا خوشگوار موسم  
کے بعد رہتا۔ مجھے سے کوچھے ایسا کرتی اور ایک لا یعنی  
بھت کے بعد آخروں کا کلی جو اس سے طے کر رکھا ہوتا۔ اسی لوبرا تا محسوس ہو رہا تھا۔ کیا نہ کسی طرح ڈپڑہ

کا دماغی کا گوشت، تازہ لحیرے بے پودینے کی، بھنپی اور کلو۔ افسانہ نگاری اس دو میں کی عورت سے علم حاصل  
ہی لے کر میں لوٹا۔ وہ صفائی والی ماہی پے اپنی علیت کے تکروں بیس نا عملان کے دنوں تو۔ اور دیسی بھی کے  
جماعت رہی تھی۔ ”تباہی! بھجے نہیں پتا، زمانہ کد ہر جا ہے۔ لوگوں رکھا یا کے پورے کاملاً گرا رہنا۔“  
کے اندر سے خوفِ خدا ختم ہو گیا ہے۔ دنیا تاہ ہو رہی  
ہے، سب قیامت کی نشانیاں ہیں۔“ ”لیکھے بغیر بھی بتا سلکتا تھا کہ میری بیوی نے اپنے بارہ  
”بھی بایا! تسلی خ آنکھ کے اوپر آخرا کارہ اس۔ سیکھے کے چرے کے تمام طول و عرض میں کمال  
غیر مسلکیں عورت کو خوف زدہ کرنے میں بھی  
کامیاب ہو گئی۔ (زیور کس پے ہوا ”بھی“ پر)۔  
”تو اور کما۔ مجھے بھلا ان باتوں کا کیا پتا۔ تو ٹھہری  
سارا دن گھر گھر کام کرنے والی سیدھی سادی گنوار  
عورت۔ تھے تو اخبار بھی پڑھنا نہیں آتا۔“

”تو بایا! آپ کو اخبار سے ساری باتیں پتا چلتی  
ہیں؟ یہ قیامت والی بھی۔“ اس کے ہوا یاں اڑ رہی  
تھیں۔

”دنیں تباہی! یہ اخباروں والے ہیں ہونہ، انہیں  
”کھو“ پتا نہیں۔“ اس نے شیر ہمی نظر سے مجھے  
سیر ہیاں چڑھتے دیکھ کر کہا۔ مجھے تاؤ آگیا۔  
”تباہی! یہ سیر ہیوں کی صفائی کیوں نہیں کی اب  
تک بارہ نج رہے ہیں اور تمہاری گپ شپ ہی ختم  
نہیں ہو رہی۔“

”بس صاب جی! ہر نے گھنی تھی سزرابا جی سے بات  
کرنے لگ گئی۔“

”تمہاری بایا! کوتوالہ موقع دے باتوں کا۔ تم کیوں  
اس کی باتوں میں آگرا پنے کام میں کو تاہی کرتی ہو۔“

”لو صاب جی! بایا! تو اتنی سیانی باتیں کرتی ہے۔  
بندہ پاس بیٹھتا ہے تو جس سیکھتا ہی ہے۔ مجھے کیا خبر دنیا  
میں کیا ہو رہا ہے۔ بایا! کا اللہ بھلا کرے، مجھے ہر روز نئی  
بات بتا دیتی ہیں۔ مجھے جاہل کو بھی اب زمانے کی خبر  
ہو گئی ہے۔ میں تو کہتی ہوں صاب جی! آپ بھی اپنی  
بیکم کے پاس بیٹھ کر چار باتیں علم والی سکھ لیا گرو۔“

”اس مشورے پے مجھے جتنا غصہ آتا کم تھا۔ میں  
یعنی کڑھی سے بھی دستبردار نہیں ہوئی تھی لہا اس  
وقت خوش رنگ خوشبو دار پلاو کے ساتھ کا لے  
دانشور، کامیاب صحافی، ہر دل عزیز شاعر اور جانا مانا۔“ زیرے کے بگھاڑا والی پیلی چالی گھاڑھی کڑھی کا بالسب۔

کا دماغی کا گوشت، تازہ لحیرے بے پودینے کی، بھنپی اور کلو۔ افسانہ نگاری اس دو میں کی عورت سے علم حاصل  
ہی لے کر میں لوٹا۔ وہ صفائی والی ماہی پے اپنی علیت کے تکروں بیس نا عملان کے دنوں تو۔ اور دیسی بھی کے  
جماعت رہی تھی۔ ”تباہی! بھجے نہیں پتا، زمانہ کد ہر جا ہے۔ لوگوں رکھا یا کے پورے کاملاً گرا رہنا۔“

”بائے تو بستے چاہی! تیرابندہ تو بڑا ”داؤڑا“ (خت)

ہے، سب قیامت کی نشانیاں ہیں۔“ ”لیکھے بغیر بھی بتا سلکتا تھا کہ میری بیوی نے اپنے بارہ  
”بھی بایا! تسلی خ آنکھ کے اوپر آخرا کارہ اس۔ سیکھے کے چرے کے تمام طول و عرض میں کمال

درج کی مظلومیت اور لاچاری بھری ہو گی۔ شاید اپنے  
جارحت کے پرانے دوپٹے کے اکٹے ہوئے پلو سے  
رکھ کر اپنے ڈیلے سے چند آنسو بھی پٹکا لیے ہوں۔  
(اوہ، میرا مطلب ہے آنکھ سے لاحول والا۔  
ڈیلے یہ عورت میری زبان و بیان پر بھی اڑانداز  
ہو رہی ہے)

”کیا کروں بن۔“ اس نے ہمدردی پا کر جھٹ  
اے، بن بناؤ الا۔ ”مود ذات ہے، سارا پچھہ جائز ہے  
بھی، ہائے بیچاری عورت۔“

اب اپنی قابل رشک یادداشت میں سے وہ عورت  
کی مظلومیت اور مرد کی حاکیت کے اپنے اپنے دل  
خراش اور عبرت ناک قہے سنانے والی تھی کہ تباہی تو  
بلکن لگ، ہی جاتی۔ شاید میں بھی وھاڑیں مارنے لگ  
جاتا، اس لیے میں نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور غسل  
فرانے تشریف لے گیا۔

ایک پبلشر جو میرا پرانا واقف کا رہا تھا۔ نیرے  
روزانہ چھپنے والے کالموں کے انتساب کو کتابی شغل دینا  
چاہتا تھا۔ اسی سلسلے میں، میں نے اسے گھرد گھنٹے تک  
اس کے آنے کے بعد میں نیچے اتر اور دو گھنٹے تک  
ڈرائیک روم میں مذاکرات ہوتے رہے۔ یہاں تک  
کہ کھانا لکنے کی اطلاع مل گئی۔

نیل پاپہ پہنچ کر نئے سرے سے میراخون کھول اٹھا۔  
آج اس نے پلاو پاپہ عمل در آمد تو کر لیا تھا مگر اپنے پسند  
یعنی کڑھی سے بھی دستبردار نہیں ہوئی تھی لہا اس  
وقت خوش رنگ خوشبو دار پلاو کے ساتھ کا لے  
دانشور، کامیاب صحافی، ہر دل عزیز شاعر اور جانا مانا۔“ زیرے کے بگھاڑا والی پیلی چالی گھاڑھی کڑھی کا بالسب۔

”اس مشورے پے مجھے جتنا غصہ آتا کم تھا۔ میں  
یعنی کہ میں۔ ریحان علی فلک۔ ملک کا مشور

63

بھرا دُونگا بھی پوری شان اور حمطراق کے ساتھ بر اجمان تھا۔ اسی پر بس نہ کرتے ہوئے اس نے بڑے ہی خیریہ انداز میں مشی کی چھوٹی سی ہائڈی بھی لاکر درمیان میں رکھ دی جس میں دیکھی کے تڑکے والا بینگن کا بھرتا بھاریں وکھارا تھا۔

اس عجیب و غریب مینو والے لنج کی وجہ سے میں نے اپنے معزز مہمان کے سامنے سخت شرمندگی محسوس کی۔ اس میں شک نہیں کہ آرزو کھانا تھیک شھاک بنایتی ہے اور یقیناً اس وقت نیبل پر موجود تینوں پکوان زائلتے کے لحاظ سے اپنی اپنی جگہ لا جواب ہوں گے مگر اچھا پاکیتا ایک الگ بات ہے اور اچھی طرح پیش کرنا ایک سراسر الگ بات۔ اتنے سالوں میں کچن کو مورچہ بننا کروہ مسالوں کے صحیح تناسب اور زائلتے کے بارے میں ملے شک جان چکی ہے مگر اتنے عرصے سے جو میں اسے سکھانے کی کوشش کر رہا ہوں، وہ سکھنے پر راضی نہیں۔ کیا چیز کب پکائی چاہیے، کس دش کے ساتھ کون سی دش پیش کرنی چاہیے۔ کس مہمان کے لیے کیسا کھانا کا کاناچا ہے۔

اب آپ ہی بتائیے۔ کوئی شریف انسان مرغ پلاو پر کڑھی انڈیل کریا بھرتہ ڈال کر کھا سکتا ہے۔

میں شاعر اس لیے نہیں بناتا کہ مجھے شاعری کرنا آتی تھی بلکہ اس لیے کہ میں سوائے شاعر کے اور پچھے بن ہی نہیں سکتا تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ میں شاعر بننیں بلکہ بن بنایا اس دنیا میں آیا۔

مجھے حسن، زناکت اور نفاست، ہمیشہ سے اپنی جانب کھینچتے تھے۔ چاہے وہ حسن کی دلکشی چرے کا ہو یا کسی حساسیل کا۔ چاہے وہ زناکت کی دل ربا کی اداوی میں ہو یا کسی خوبصورت خیال میں سے چاہے وہ نفاست کسی کی عادتوں میں موجود ہو یا میرے ارد گرد کے ماحول میں سیسی میرکی پتھر حکن پرستی اور نفاست پسندی نہتے شناکری تھی۔

(زیرِ نہیں) ایک متوسط بھرائی نے ہستے تعلق (زکھتا تھا) تین بھائیوں اور دو بہنوں کے بالکل درمیان میں۔ میرے زرخان جمع زرخانہ (زرخانہ حکن) پرستی اور سرافست

والد ایک سید ہے سادے دکاندار ٹائپ آدمی تھے۔ تعلیم اس حد تک تھی کہ دکان کا سودا اور خواریوں کا حساب کتاب لکھ لئے تھے۔ تینوں بھائیوں میں سے کوئی میٹرک سے آگئے نہ بڑھا کیونکہ آگئے بڑھنے کے لیے میٹرک پاس کرنا ضروری ہوتا ہے اور وہ ان تینوں میں سے کوئی نہ کرسکا۔

والدہ بچپن میں، ہی گزر گئیں۔ (میرا مطلب ہے، میرے بچپن میں) تین میں سے دو بھائیوں نے اب اکی زندگی میں، ہی اپنا اپنا حصہ لے کر الگ بزنس شروع کر دیا۔ (دکانداری ان کے نزدیک بزنس، ہی تھی)۔ ایک نے جوتوں کی دکان والی دوسرے نے اب اکی دیکھا دیتھی جنل استور کھولا۔ دونوں شادی بھی کر کے تھے۔ خیر سے دونوں کی بیویاں جہالت میں اپنی مثل آپ تھیں۔ تیرے بھائی نے وہی کا نکٹ کھایا اور پھر ہو گیا۔ تینوں جلد ہی اپنی زندگی میں سیٹ ہو گئے۔ بڑے کی جو تیاں خوب خلنے لگیں اور جوئی کے زوڑی پر، ہی اس نے اپنا مکان بھی خرید لیا۔ اب وہ ہفتے کے سبقتے آتا اور اس کی گھری سانوں بیوی پیلے پیلے سونے کے بدوضع موئے کڑے لہراتے ہوئے نئی نئی سیکھی اردو بولنے کی کوشش کرتی۔

دوسرے کو غیرت آئی۔ اس نے بھی ملاوٹ، ذخیرہ اندوڑی اور دو نمبر مال کے سارے اپنا جنل استور و سیع کر لیا۔ اب اس میں آئس کیم والی مشین، فوٹو اسٹیٹ مشین اور پیسی اور کا اضافہ بھی تھا۔ اس کی بیوی کی رنگتے حد سفید تھی۔ وہ کشمیرن کیوں پچھے رہتی سونے کی نمائش سے۔ سواس کے موئے موئے بازوؤں کی چربی بھی سونے کی چوڑیوں میں پھنس یا دھنس گئی۔

وہی والے نے وہاں ایک پاکستانی فیملی کی بیوہ سے شادی کر لی اور دونوں بڑے بھائیوں کی ترقی کو پیچھے چھوڑ دیا۔ اس کے درافت دونوں بہنوں کو شان سے بیاہ گئے۔ اب اجی سکون سے وفات پا گئے۔

صرف میں رہ گیا جو "اپ سیٹ" تھا۔ دراصل نہ میری تعلیم تکمیل ہوئی، نہ شادی اب تک ہو سکی تھی؛

لہلہی میری جوتوں یا نہنک منجذب الول کی دکان زوروں پر انتہا تھا۔ اب انتہا میں ان کی نظریوں میں بھی تک بیٹھا۔ اور کھا تھا۔ بھا بھیاں اپنی بھنیں میرے سرمند ہنے آئیں۔ بڑی بھا بھی کی آن سے بھی کالم بہن، چھوٹی بھا بھی کی آن سے بھی میتوں بھن۔ شکر ہے دنی والی بیبھے ہے۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا، دونوں بھائیوں کی بہنوں سے بمشکل اپنا بچاؤ کرتے ہوئے میں ان دونوں دو دو ماڑوں پر بیک وقت ڈالتا ہوا تھا۔ ایک مجاز تو اردو ایم اے کا تھا، دوسرا عشق کا۔ مجھے ڈگری یافہ کھلانے کا ڈن تھا لیکن یہ شوق ایم اے اردو کی ڈگری لے کر ہی پورا ہو سکتا تھا جس کی ہمارے معاشرے میں گئی گزری نئی حیثیت ہے اور یہ ڈگری اگر کسی ایسے "مرد" کے ہاتھ میں ہو جو اس کے ملبوتے پر ملازمت مانصل کرنے کا خواہشمند ہو تو یہ حیثیت گئی گزری بھی دیں ہوتی۔

یہی وجہ تھی کہ پنجاب یونیورسٹی کے اردو اپارٹمنٹ میں میرے علاوہ بس دو ہی اور لڑکے تھے اور ہم تینوں ڈیڑھ درجن لڑکوں کے جھرمٹ میں جیسے۔ جیسے ذرا حواس باختہ رہتے۔ (ویسے آپ ان "جھرمٹ" لفظ کو "زرنگے میں" بھی پڑھ سکتے ہیں)۔

اور ان میں سے ایک لڑکی ایسی بھی تھی جسے سامنے اکے میں معمولی سے زیادہ جھینپا اور حواس باختہ لگا کرتا۔ وہ لڑکی تھی غزالہ درخشش غزل پس غزل اس کا قائم تھا۔ اپنے ڈیارٹمنٹ کے اولی بجھے میں اس لڑکی زیلیں چھپتی رہتی تھیں جو سراسر میری میرانی تھی ایونکہ میں اس زمانے میں اس مجلہ کا ایڈیٹر تھا اور میری کے اقتپے میرا نام دیکھرے دیکھرے نمایاں ہو رہا تھا۔ میں کئی مشاعروں میں شرکت کیا کرتا تھا۔ کاغز کے اراب یہاں بھی لوگ مجھے ایک شاعر اور افسانہ نگار

کی حیثیت سے جانے لگے تھے۔ پہلے پہلی وہ بھی اپنی ایک غزل کی تصحیح کے لیے میرے پاس آئی تھی اور میں اسے دیکھتا کارکھارہ گیا تھا۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی اس کو کن اکھیوں سے کئی بار دیکھا تھا اور اسے ایگزامز ہونے سے اس کی جلوہ آرائی سے میرا عاشق مزاج اور حسن پرست مل حدود رچہ متاثر ہوا تھا۔ وہ اسم باسمی چکی۔ سراباغزل تھی۔

ایس کی بڑی بڑی حیران اور روشن آنکھیں، ان پر سلیمان گھنیری خمدار پلکیں۔ سونے کی سی چمک لیے صاف گندی رنگت جو صحت مندی کا گلال رخراویں اور نازک سے بول پر لیے ہوئے تھیں۔ اس کی آواز بھی بے حد کولی اور تسلی تھی۔ جب وہ اپنی نوآموز غزل کے کچے پے شuras سحرانیز آواز میں سنا تی تو سننے والے کا دھیان قافیہ اور رویف کی کمزوریوں کی طرف جاتا ہی نہیں تھا۔ دھیان میں رکھنے کے لیے اور بست کچھ تھا۔ اس کے زم و نازک مصورانہ سے ہاتھ، مخروطی انگلیاں، پاکیزہ کی میناکماری سے بھی زیادہ حسین پاؤں۔ صراحی دار گرد، گھنگھریاں شانوں سے بس ذرا سائیچے آتے گرے بھورے بال جو ریشم کے سری چھوٹوں کی صورت بکھرے رہتے۔ اس کی زلفوں کا پریشان رہنا اسے ایک مکمل شاعرہ کے طور پر پیش کرتا تھا۔

ہی محبت کے مرحلے طے کرنے لگی۔ ہم دونوں کی شاعری میں، ہی دردار بھی زیادہ نہیں ہونے لگا۔ شاید یہ ہمارے عشق کا اعجاز تھا۔ ادھر ہمارے ایگزامز ہونے والے تھے۔ ادھر میرے پہلے شعری جمیعے کی اشاعت آخری مراحل میں تھی کہ اچانک غزال نے اپنی غزالی آنکھوں میں آنسو بھر کے، اپنی ہفتنتی آواز میں سوز بھر کے مجھے یہ منحوس خبردی کہ اس کا رشتہ اس کے فرشت کزن سے طے ہو گیا۔ جو ناروے میں جا ب کرتا ہے۔ یہ خربجھ پے بجلی بن گرگری، میں اس کے آسم گزگڑا اٹھا۔

"تم کو میری محبت کا واسطہ بغاوت کر دالو، ہار مت مانو ظالم سماج کے سامنے مجھے یہ جداں ہرگز منظور نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔" میں نے اپنے تازہ ترین فلم سے متاثر ہو کر عالم نزع والی ہجکیاں لیں۔

"میں ایک مشرقی لڑکی ہوں بمحاجن!“ دوپٹے کا پلو مروڑتے ہوئے خوابناک لبجے میں کہتی اب وہ شیم آرائی ہوئی تھی۔

"میں اپنے والدین کے سامنے تمہارا نام کیسے لے سکتی ہوں۔ مجھے ان کی عزت بھی عزیز ہے۔ میں اپنا پیار قریان کر سکتی ہوں مگر ان کی عزت پر حرف نہ آنے دوں گی۔“ اس نے بابہ شریف کی طرح پر عزم لبجے میں کما۔

(ان دونوں یہی مقبول اداکارا میں تھیں ہاشمی داریں ولجمیں یوں سنایا کرتی کہ جن شعراء کا وہ کلام ہوتا ہے اگر سن لیتے تو غزال کے نام منسوخ کر دیتے۔ سزا رطہنگ کرج کے اعلان کرتی۔

”نہ صرف ادب اور تھنکتو بلکہ لباس کے معاہدے میں تھیں۔“ شیری آن۔ پیٹاپا لے۔ تیری آن۔“

بھی اس کا ذوق قابل تحسین تھا۔ وہ موسم کی مناسبت سزا رطہنگ کا صائمہ کی طرح گزندہ اسے اٹھا لیتی۔ رے کر گنوں اور فیضن کے لحاظے اسکا مل کا انتخاب گیا۔ سزا رطہنگ کو رب دی سوں، گڑی پنجابن تیری اے ولدارا۔“ کرتی۔ سرگنگ اس سزا کا کھل اٹھتا تھا۔ ہماری روستی جلسہ سزا رطہنگ ایسا کیسے ہو سکتا تھا، وہ اسی کی روحلائی کے آخری سال

تھے محبت میں ترپ ضرور تھی مگر عشق ابھی اندر ہانہ۔ ”آپ کیا آنکھتے ہیں؟“ اس کی شادی کہ بروہتی آورنی، اسے مال کے جو تے اور باب کے ڈنڈ کے بندے ہے ادا آئیں کہ کوئی بھی اس کے ساتھ آنکھوں سے بھی بخوبی نظر آجائے تھے۔“ میں تم پر الزام نہ آنے دوں گا۔ اپنی بھا بیویوں کو۔“ غزال کی مکمل پسند اور رضامندی شامل تھی بلکہ کافی شرفا نہ کوشش کی۔“ ”مجھے صرف اپنے والدین کی ہی نہیں، تمہاری۔“ میں نے ایک اور رشتہ لئے تمہارے گھر بھیجا ہوں۔“ میں نے ایک اور مم کے دنوں میں وہ کلاسز چھوڑ کر اس سے ملنے جایا کرتی عزت بھی پیاری ہے۔ برامت ماننا مکرم کس بل بوتے پے میرارشتہ مانگو گے۔ تمہارے پاس نہ تملaz ملت ہے،“ نہ ہی جائیداد۔ میری خالہ کا بیٹا اجینسر ہے، ناروے میں ایک اعلا فرم میں ملازم ہے۔ میرے گھروالے اس کے مقابلے میں بھی تمہارا رشتہ قبول نہیں کریں گے۔ وہ تمہاری بے عزی کریں گے اور یہ میں برواشت نہ کر سکوں گی۔ میں زہر گھاولوں گی۔“ ”نہیں، تم زہر مت کھانا۔ میں تمہاری متنکنی کے لذو کھا لیتا ہوں۔“ میں نے گلوکر لبجے میں دل کڑا کر کے کھا اور لرزتے ہاتھوں سے اس کی گود میں رکھے ڈبے سے لذو اٹھا کر منہ میں رکھ لیا۔ منہ میں میٹھا میٹھا اللذو۔ آنکھوں میں نمکین آنسو سے واہ کیا روانوی منظر تھا۔ اسی رات میں نے اپنی سب سے مقبول اور زبان زد عالم ہو جانے والی لکھم کی۔“ غزال اس روز کے بعد یونیورسٹی نہیں آئی۔ وہ امتحان بھی نہیں دے رہی تھی۔

”میں یہاں کیسے آسکتی ہوں، جہاں کے چتے چتے سے ہماری محبت کی یادیں وابستہ ہیں۔ ویسے بھی تعلیم توکیا، اب مجھے زندگی سے بھی دلچسپی نہیں رہی۔“ بس تی رہے ہیں۔“ اس نے سرو آد بھری اور آخری بار بھری۔ خدا نخواستہ میرا مطلب یہ نہیں کہ اس آہ کے بعد اس کا دم نکل گیا بلکہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میری زندگی سے نکل گئی۔ میری شاعری کو ہجر کا درد، میرے انسانوں کو جدائی کا عمدہ کر۔

اس کے جانے کے تین دن بعد، اس کی ایک دوست نے بے حد دل جٹے انداز میں مجھ پے اکشاف کیا۔“ میں میرے تھے کی خالہ، آپاں صغار آگے آئیں۔ دو میئے ہی راضی تھیں۔ مجھے ہر کسی میں کوئی نہ کوئی اعتراض

میں جاتا۔ کئی ایک بار تو تصویر دیکھنے کی نوبت تک نہ  
آل۔ مجھے اڑکی کامیابی اس کے والد محترم کا پیشہ ہی پسند  
نہ آتا۔

”اب میری یہ اوقات رہ گئی ہے کہ میں ملک کا  
ابھرتا ہوا نامور شاعر، ایک نوجوان، باصلاحیت افسانہ  
نگارہ بحث علی ٹلک کی قصائی کی دختر نیک اختر سے  
بیا رچالوں جو میرے ہر شعر کو اپنے باپ کی طرح  
”ٹوکے“ کے وار سے فتح کر دیا کرے گی اور یہ دوسری  
والی لاحول ولایہ کیا غیر شاعرانہ نام ہے اختر  
صابری۔ لگتا ہے کسی قول سے شادی کر رہا ہو۔“  
نوال رشتہ لے کر آپاں آئیں تو میں نے صاف  
صف کہہ دیا۔

”آپاں! میرے لیے ان مل پاس اور میڑک فیل  
لڑکوں کے رشتے مت لایا کریں۔ لڑکی بے شک  
متوسط طبقے کی ہو، بھلے غریب گھر کی ہو مگر گھرانہ سمجھا  
ہوا ہونا چاہیے۔ باپ چلے ہے سرکاری اسکول کا غریب  
ماشہ کیوں نہ ہو۔ لڑکی تعلیم یافتہ ہو، زم مزاج، خوش  
عقل، خوش گفتار اور مناسب حد تک خوت شکل بھی  
ہو۔“ اب پتا نہیں میری شرائط آپاں کی سمجھے میں  
آئیں یا نہیں۔ بہر حال انہوں نے کہا۔  
”لڑکی پڑھی لکھی ہے چودھویں جماعت کا امتحان  
دیا ہے۔“

”لی اے کا، اچھا اور گھرانہ؟“ میں نے کچھ کچھ  
وچکی لی۔

”پیو تو ہے نہیں، مال البتہ جویں اُن پڑھ ہے۔ ویے  
نماز، قرآن پڑھا ہوائے۔ بڑی عبادت ہے۔“  
”مجھے لڑکی کی مال کے اوصاف سے کیا پچھی ہو سکتی  
ہے۔ چاکروہ ”عبادت“ ہوتی یا ”شوتن۔“

”دو بھائیوں کی اکلوتی بھن ہے۔ وڈا بھائی پولیس  
میں کاشیل ہے، دوسرا ایک ڈاکٹر کا وفات ہے۔ وہ نہیں از ریلت ہے۔ میں کرے میں داخل ہوا۔ آرزو اپنے جیز  
ہو ماجو پریلوں میں دو ایمان پیٹکر کر دیتا ہے۔“ وہ ریت از ریلت کے بیٹھے لال غیرارے میں لمبا سا ہون گھٹ نکالے سر  
”اچھا اچھا۔ کیا وہ نہیں۔“ مجھے کو الفہر کسی جائز رجھکائے بیٹھی ہمی۔ میں نے بادا رنگ کی شیر والی کی  
تکڑتکڑی بجھن لگا، ورنہ اس سے پہلے جو کہ آئی، جب تھپتھا کے اس انگوٹھی کی موجودگی کا اطمینان کیا  
ان لڑکوں کے والد حضرات ما قصائی ہوئے پا در ذی ستر رجھ میں نے آسے منہ دکھائی کے تھے کے طور پر دینے

کے لیے خریدی تھی۔ اگرچہ منہ تو میں دیکھی ہی چکا تھا۔ جس سمت بھی دیکھوں نظر آتا ہے کہ تم ہو  
تصویر میں۔ تصویر کا قصہ بھی عجب ہے۔ میں نے آیا۔ اس کا گدر ریا ہوا سازم نرم ہاتھ تھام کر میں نے  
کی۔ کچھ پس و پیش کے بعد وہ لانے پر راضی ہوئیں۔ اس کی مسکراہٹ نے حوصلہ بھایا تو اس کا ہاتھ اپنے  
کو دیکھنے لگا جس میں کھڑی آٹھ نواز کوں میں تھے مجھے ہم سینے پر رکھ کے میں نے دوسرا شعر سنانے میں کسی

یہ دریافت کرنا تھا کہ میں میں آرزو کوں سی ہے۔ تیاں۔ تکلف لے کام نہ لیا۔ اس دید کی ساعت میں کئی رنگ ہیں لرزائ  
کے انگلی رکھ کے بتانے پر میں نے سکوڑی ہوتی آنکھوں کو مزید نچوڑا۔

”جی یہ میں ہوں، آرزو۔“ اس نے کچھ الجھ کے  
لیکن دلانے والے انداز میں وضاحت دی۔ مجھے دھپکا  
سالا۔ شاعری کے معاملے میں اس کی کم فہمی پر بھی اور  
اس کی کھڑوری کرخت آوانی سے لوح اور تدرے  
دیساتی لب و لبجے کوں کرب بھی۔ بمشکل مسکرانے کی  
کوشش کرتے ہوئے میں نے خود کو یہ کہہ کر بھلا کیا کہ  
اتا مکمل تو کوئی بھی نہیں ہوتا۔ آواز سے مار کھاتا ہے تو  
کیا ہوا، صورت شکل تو لاکھوں میں ایک ہے۔

”میں جانتا ہوں تم آرزو ہو، میری آرزو۔ بلکہ  
میری تمام تر آرزوؤں کی تعبیر ہو۔ یہ تو میں نے  
تمہارے حسن کو خراج حسین پیش کرنے کے لیے  
اشعار کئے ہیں۔“

”میں بھی آپ کو شعر سناؤں۔“

”زہے نصیبہ“ میں بھل اٹھا۔

”عرض کیا ہے۔

مقدار میں لکھتے تھے تم اسی سل

میں اوی اڈی جاواں ہوا دے نہل

میرا دارغ بھک سے اڑگیا۔ وہ ہر لحاظ سے سنجیدہ نظر

آرہی بھی۔ میرے منہ کھول کر دیکھتے رہنے کو وہ شاید

داد دینے کی کوئی ادا سمجھی۔ اپنا بھاری آنچل درست

کرتے ہوئے پھر سے گویا ہوتی۔

تمہیں پاکر میرا ہوا ہے وہ حل

تے بھگ گئے کنڈلاں والے بال

میں سمجھ گیا کہ آپا نے ایک گھری سازش کے

ذریعے مجھ سے میرے بزرگوں کا کوئی بدله لیا ہے۔

بھائی صاحبین بھی رکھہ ڈرائیور، سبزی فروش ہوتے  
تھے مجھے ان کے پیشوں پر اعتراض نہ تھا، نہیں ان  
کے اس روزگار کوبرا سمجھتا تھا، میں یہ ضرور تھا کہ میری  
خواہش بھی میری بیوی نہ صرف خود تعلیم یافتہ ہو بلکہ  
تعلیم یافتہ ماحول سے آتی ہو۔ چاہے اس کے بھائی یا  
باپ سرکاری افسر یا پروفیسر، داکٹر، انجینئرنگ ہوں۔  
معمول پڑھے ہوں، سفید پوش ہوں۔

”نام آرزو ہے گوری جوی، اوپری بھی کالے سیاہ،  
لبے بال پائے پاء کی آکھ۔“ آپاں نے مزید کو انف  
گنوائے۔ لڑکی کا نام آرزو مجھے اس قدر پسند آیا کہ اس  
کی آنکھ پا چڑائے کے بجائے رتی، تو لہیا ماشہ برابر بھی ہوتی  
تو منظور تھا۔ بعد میں میرے پوچھنے پر آپا یہ خبر بھی  
لا میں کہی اے میں اس کے مضامین کیا تھے۔

ایک تو اسلامیات، دوسرا یہ کہتے ہیں۔ ہالے  
پیچھر۔“ وہ ذہن پر زور ڈال کر لویں۔

”پیچھر سے یہ گونا۔ اونٹ لڑپکر۔“ میں مسرو  
ہوا۔ (ضرور اردو یا الکش لڑپکر ہوتی ہوگی۔ وہ سو دینی  
تعلیم بھی اور اولیٰ تعلیم بھی۔ میرا کھر سنور جائے گا۔)

میں نے کرائے پر فلیٹ حاصل کیا۔ قلم کی بدولت  
اتا مل جاتا تھا کہ گزارا ہو جاتا تھا۔ من گائیں ابھی اتنی  
نہیں بڑھی تھی پھر بھی میں نہیں چاہتا تھا کہ میں  
بھائیوں کے ساتھ رہوں اور ان کے ٹھاٹھ بائھوں دیکھ کر  
میری بیوی کی قسم کے احساس کرتی میں بتلا ہو۔ اپنا  
چھوٹا سا گھر میں نے اپنی محنت کی کمائی اور آرزو کے

سالہ سے جیز سے سجا لیا۔ مجھے آج بھی اپنی اور آرزو کی  
پہلی ملاقات یاد ہے۔ (ضروری نہیں کہ صرف خوشگوار  
یادیں ہی حافظے پر قابض رہیں۔ بھی بھی۔)

وہ ہماری سماں رات تھی، عام سماں راتوں سے  
بے حد مختلف کیونکہ یہ ایک رومانوی شاعر کی سماں

میں کاشیل ہے، دوسرا ایک ڈاکٹر کا وفات ہے۔ وہ نہیں از ریلت ہے۔ میں کرے میں داخل ہوا۔ آرزو اپنے جیز  
کے بیٹھے لال غیرارے میں لمبا سا ہون گھٹ نکالے سر

”اچھا اچھا۔ کیا وہ نہیں۔“ مجھے کو الفہر کسی جائز رجھکائے بیٹھی ہمی۔ میں نے بادا رنگ کی شیر والی کی  
تکڑتکڑی بجھن لگا، ورنہ اس سے پہلے جو کہ آئی، جب تھپتھا کے اس انگوٹھی کی موجودگی کا اطمینان کیا  
ان لڑکوں کے والد حضرات ما قصائی ہوئے پا در ذی ستر رجھ میں نے آسے منہ دکھائی کے تھے کے طور پر دینے

سلگتے ہوئے میں نے سوال کیا۔

"کیا تم نے واقعی بیان کے پرچے دیے ہیں؟"

"ہاں جی۔" "میں نے مذکور کیا۔

"کیا تمیں لیکھنے ہے، وہ بیان کے پرچے ہی تھے؟" میں نے دہرا لایا۔

"ہاں جی! کوئی پہلی دفعہ دیے ہیں جو بتائے ہے جلتا۔ دو سال سے وے رہی ہوں۔"

"کیا؟" میں بخونچ کارہ گیا۔

"بی اے کے پرچے اور کیا۔" "اور الیف اے کسے؟"

"بی اے نے پوچھیں جی! اس کے مکمل پرچے تو تین سال تک دیے تھے، جو تھے سال کمپارٹ کی وجہ سے الکاش اور مطالعہ پاکستان کے بھی دینے پڑے۔ ہاں دوسروں میں نے "سوہنی" (آسان) کرلی تھی۔ پہلی بار وہ تھی پانچ پرسوں میں لیکن دوسری بار صرف الکاش اور حساب کے پرچے دینے پڑے لیکن میں نے کہہ دیا ہے جی! اب رزلٹ آیا تو چاہے کمپارٹ آئے لیکن میں نے کوئی دوبارہ پرچہ میں دستا۔" وہ چند گھنٹے پرانی دسمبر کی تلفی سے اپنا شاندار تعلیمی ریکارڈ سنانے کے بعد اب کندھے ہلاہلا کے لاذ کامظاہرہ کر رہی تھی۔

"نے تم نے بی اے میں اسلامیات اور لزیچر رکھا، ہوتا الکاش لزیچر یا اردو۔"

"پنجابی لزیچر اس میں میں بڑی تیز ہوں۔ ایک تو یہ دیے، ہی میں زبان دوسرا میری ماں بولی۔ اور تیسرا بات آسان بھی ہے۔ آج تک اس میں میں بھی نہیں ہوئی۔ الیف اے میں بھی ہر دفعہ پنجابی میں، ہی زیادہ نمبر آئے۔" اب مجھے اس کے لمحے میں جھلک سارے ملائی اور سراسر انداز کاراز معلوم ہوا۔

اگلے کئی دن اس کی ہمہ صفت شخصیت کے نتیجے پہنچا، بھر راشکار ہوتے رہے اور میں ماؤسی کاشکارس اموزیتی پھرک جاتی۔ وہ اگرٹی دی یا ایشپ ریکارڈر آن ہو ساگرا۔ تعلیم کرنے اس کا کچھ نہ سنبور اتحا بلکروہ تین کریتی، پورا کمرہ نور جہاں کی آواز کی دہشت سے تھرا تھن کیاں ایک یا کلائیں میں انکار کر تھیں۔ اس کا اندازہ پہنچ بھاڑس رکھتا۔

چکی تھی۔ بلا کی باتوں تھی۔ اس کا اندازہ پہنچ کیا۔ میں دل تیرے قدماں بوج رکھا

70

## شاعری مجموعہ، ایک بیٹی اور ایک پیٹا میری قابل ذکر

تھیاتیات، تحریف۔ اخباری ہجاء صنے میرے مستقل

ارین اس کی دھمکی میں آجا تا، جا کے رکھانہ پاتا۔

"سن سن بھالی دھول پاوجدا سدھر گئے اس و کروں کے فلیٹ سے نکل کر میں

ایک نسبتاً بڑے کرائے کے مکان میں شفت لی؛ دھول نہ دھتے میلہ ذرا نشین سجدہ

اس کے دھول کی دھناؤ ہم میرتے اس افسانے میں، ہو گیا۔ ایک نیا اوسنک اسکیم میں نہایت ستاپلات

میں اتر آتی جس میں میل، ہیر و ہیروں کا ملن پیرس کے سبھی کے لیا۔ اٹے پچھے سالوں میں میں اس کی تغیر

کا کام بھی شروع کر دیا۔ اور دو سال پہلے ہی میں اپنے

اس گھر میں شفت ہوا تو پھر بیس سالوں کی تھکان پل بھر میں زائل ہو گئی۔ ایسا کا جیسے آج میں اپنے بچوں

کے لیے کچھ کر پایا ہوں۔ اللہ نے مجھے بست زہن و فطیں سلمجھے ہوئے خوبصورت بچوں سے نوازا تھا۔

خصوصاً" میری بیٹی جاتا۔ اس کی ذہانت سے بھر پور چمکتی آنکھوں کو دیکھ کر میرا سیروں خون برمہ جاتا تھا۔

اس کم عمر میں اس کی سلجمی ہوئی دانشورانہ گفتگوں کر میرے حوصلے جوان ہو جاتے تھے۔ میری امید بند ہنئی لگتی تھی کہ وہ ضرور مستقبل میں میرا نام روشن کرے گی۔

آج اپنی جدوجہد کے میں سال اور شادی کے پندرہ سال بعد اپنی زندگی پر نظر دوڑا تو بظاہر کسی چیز کی کمی نظر نہیں آتی۔ زندگی نے لیا کم، دیا زیادہ تھا۔ اس کے باوجود ایک شنگی سی بھی جونہ دل سے نکلتی تھی نہ روح سے۔ ایک اوہرے پن کا احساس تھا جو کہ ہونے کے بجائے روز بروز بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اسے دوستوں کو اپنی اپنی شریک حیات کے ساتھ مگن و متمکن رکھتا تھا تو کڑھ کے رہ جاتا تھا۔ شادی جیسے اہم اور نا扎ک معاملے کی ساری ذمہ ذری آپاں صغاراں جیسی خاتون کے سر ڈال دینے والی اپنی حماقت میں آج تک معاف نہیں کر سکا۔ یہ وہی تھیں جن کی وجہ سے ملک کے ایک عظیم دانشور، نامور مصنف، نکرانگیز کالم نویس، شہرت یافتہ صحافی، حاس شاعر اور قابل تدریجی کے نصیب میں آرزو جیسی علم و ادب سے بے بہرہ، حسن ذوق سے کوری اور انتہائی بے ذہب و بے اطوار خاتون آئی۔

"ہائے یہاں چڑھانا (سفید بال) ہیں، اس طرح تو اور ہاہوں سے پو (نحو) لو میں جا رہی ہوں۔

ہر پرے پر۔ آپ آرام سے صفحے کا لے کرو۔"

بب وہ میرے لکھنے کو صفحے کا لے کرنے کا نام دیتی تو مرا ذون کھول کے رہ جاتا۔ جب وہ ہماری اچھی بھلی الالی کو "ہنیرا" قرار دیتی، میرا کھولتا ہوا خون۔ ظاہر مزید کھونے کے علاوہ اور کیا کر سکتا تھا۔

مجھے خدشہ تھا کہ علم و فن سے اتنی لیے بہرہ، ارب اس قدر ترک تھا کہ کرسی میز رکھنے کی جگہ، ہی نہ تھی تو

اسے بھی آرام کرنا یاد آ جاتا اور وہ اس قدر کرو میں بدلتی تا انکیں جھلکاتی کہ مجھے سے تحریر کرنا تو شوار ہو جاتا۔

ایہ یہ دکھ کا اعجاز تھا۔ من پسند فیض میرزہ آنے کا

ام۔ ایک ہم ذوق ساتھی سے محرومی کا دکھ۔ سارے اکی تیزی میں راتوں کو جاگ جاگ کر صفحے کا لے کے نکلتا۔

شاری کے پانچ سال میں دو شہر آفاق نادر، تمن

”سریہ اپنی نشست والوں کی جانب سے دعوت  
نامہ آیا ہے کسی شعری مجموعے کی تقریب رونمائی  
سے آپ کو مہمان خصوصی بنانے کی درخواست بھی  
کی گئی ہے۔“

میرے استھن نے مجھے مطلع کیا۔ مہمان

خصوصی بننے کا چسکہ، بست تھا مجھے اور اس پسکے کو پورا کرنے کے لئے مجھے بے کار ترین کتابوں پر بھی

بیباچے لکھنے کو کہے جاتے یا مقامے پڑھنے کی درخواست کی جاتی۔ میں وہ بھی قبول کر لیتا۔ اور یہ دعوت نامہ جس ابی نشست کی جانب سے آیا تھا اُس کا تو خاصاً نام تھا انہوں نے کئی ابھرتے ہوئے شاعر دل کو متعارف کرایا تھا۔ پچھلے سات سالوں سے میرا کوئی بھی شعری مجموعہ منظر عام پر نہیں آیا تھا۔ البتہ اس دوران میرے دو نئے ناول اور ایک سفر نامہ ضرور چھمپ کے مقبول عام ہو چکا تھا۔ دراصل ناول لکھنے کے دوران دل سے زیادہ رماغ متحرک رہتا ہے۔ احساسات سے زیادہ تکنیک، مہارت وغیرہ کا عمل داخل زیادہ ہوئے اور رماغ تو میرا چلا ہوا..... اوہ خدا خواستہ میر مطلب یہ نہیں کہ میرا رماغ چل گیا ہے۔ میں کہنا چاہتا ہوں کہ میرا رماغ اب بھی خاصی چالو حالت میں ہے، ناول نگاری کا میرا فین مزید نکھر چکا ہے۔ مگر شاعر سرا سر دل کی زبان ہوئی ہے اور میرا دل وہ بھی اب میری طرح عمر کے اٹالیسوں سال میں داخل ہو چکا ہے۔

بے نا بے شاعروں لے دل، یعنی جو ان رہے ہیں  
مگر میری جوانی کو تو آرزو کھا کئی۔ میرا آخری شعری  
مجموعہ حسب توقع پذیر ای حاصل نہ کر سکا تو ظاہر  
بات ہے کہ میرا دل اچھات ہو گیا۔ شاعری کی جانب  
رجان بھگی کرم رہا۔ کچھ سالوں سے جو کچھ بھی لکھا تے  
فی الحال شائع کرانے کی ہمت نہیں کہ بطور شاعر میر  
(سماں کو نقشبندیہ پہنچئے) میرے اینداہی شعری مجموعہ  
اب تک نوجوان لڑکے لڑکیاں شوق و ذوق سے  
(خوبی دیتے ہیں) اور محبت در کی یادوں کارکرکے طور پر ایک  
دوسرے کو بھی دیتے ہیں۔  
رسنہ مشارعوں میں شرکت نہیں ایک کرم کم ہی جزوی تھے

خصوصاً ”بیرون ملک ہونے والے مشاعروں میں بھتی  
اب مدعو نہیں کیا جاتا۔ اس لیے مذکورہ کتاب، جس کی  
تقریب رونمائی کے لیے مجھے عزت بخشی جا رہی تھی۔  
اس کی شاعرہ میرے لیے قطعی اجنبی ہوئی چاہیں  
کیونکہ ان محترمہ کا تعلق اسلو ناروے سے تھا اور  
وہیں ہونے والے اردو مشاعروں میں وہ شرکت کیا کرتے  
تھیں لیکن میں شاعرہ کا نام پڑھتے ہی چونک گیا۔  
”غم۔ الہ در خشایر غرباً۔“

یہ نام میرے لیے قطعاً ”اجنبی نہ تھا۔ میں نے کتاب کی پشت پر دیکھا۔ یا تو غزالہ نے کوئی منتر پھونک کے اپنی عمر سن ستائی پر روک رکھی تھی یا پھر میری طرح وہ بھی کتابوں پر اپنی اٹھارہ سال پر الی تصویریں چھپوانے کی شوق تھی۔ میں نے بے تاب سے اور ات ملئے، وہی انداز وہی فکر۔ وہی المہین وہی تھے میشے جذبات میں حیرت زلا ہو گیا۔ پیشتر غزلیں وہ تھیں جو میں نے اس کے حصر کے قصیدے، یا عشق کی ترب میں بے قرار ہو کر لکھی تھیں اور اس نے میرا باتھ تھام کے اپنی غزالیں نشانی آنکھیں میری دبڑیاں آنکھوں میں گاڑ کے اپنے بے حد شیرس و مخمور آواز میں یہ فرماںش کی تھی۔ ”فلک! آپ کو قسم ہے میری محبت کی! ان اشعار زانے کی ہوا مست لکنے وہنا، ورنہ میرا عشق بدنا ہو جائے گا۔ یہ غزلیں صرف میرے دل پر کندہ ہو کے لئے ہیں، انہیہ صرف میرا آخرت کے۔“

کے یہیں ان پر سرفہرست شاعر ہے۔  
اس کی ایسی باتیں ہی تو مجھ سے رومان پرست شاعر  
کو لوٹ جاتی تھیں۔ میں نے وعدہ کر لیا تھا، ان غزلوں  
کی واس کے نام منسوب کر کے اسی کو تھنے میں دے دے  
تھیں۔ اور اس نے... اس نے ان غزلوں کو معتمد  
سے روبدل کے ساتھ اپنے نام سے شائع کرالیا تھا۔  
تب دلی بھی بس وہاں کی گئی تھی، جہاں سے پڑھنے والے  
کو شاعر کے بجائے کسی شاعر کا لگان گزرتا۔ مجھے بلکہ  
مگر اٹھلے ہی لمحے انساب پڑھتے ہوئے یہ کہا  
بھی دور ہو گیا۔ اس نے لکھا تھا۔  
”اس کے نام، جس نے مجھے غزل کہنے کا ہنر سکھا

میں نے میرے فن کو نکھار دیا۔ ”  
”ظاہر ہے، یہ عظم ہستی شوانے میرے اور کون  
اٹی نہیں۔ میں اس کی اس حرکت کو بھی حسن کی  
ال ادا جان کے درگزر کر گیا۔ میں نے اس حفل میں  
ہائے کاعندیہ ظاہر کر کے اپنے اسٹرنٹ کو بتایا۔

اپنے بچے کچھے بالوں میں انتہائی احتیاط سے گنجھا  
ہاتے ہوئے میرا ہاتھ کاپ کے رہ گیا۔ اپنے کرے  
ل تھائی میں میں اپنے ہی خیالوں میں مگن رہتا تھا۔  
میں میری الگ دنیا بسا کرتی۔ اوپر کے پورشن میں  
رُوروم ہنانے کافی ملے بھی درحقیقت ایک گھری سازش  
تھی۔ آرزو کو ہمسایوں سے قابلِ رشک تعلقات  
ہانے کا مراد تھا، کچن سے بھی اس کی گھری پاری  
تھی۔ یہ یارانے اور پوابے پورشن میں بیٹھ کے نہیں  
ہمائے جاسکتے تھے۔ سو وہ دن کا بیشتر حصہ یہ پے  
گزارا کرتی۔ ہاں کبھی کبھی اچانک دھواوا ضرور بول دیا  
راتی جیسے کہ اس وقت اس نے کیا۔ میں نیک سک  
تیار، خوشبوؤں میں نہیا، گنگلتے ہوئے اپنی  
ہاری گوفائل رچھ دے رہا تھا۔ جب اس نے صور  
اسرائیل عین میرے کانوں میں پھونکا۔

ابی سے ہو :  
میرا ہاتھ کلپا اور کنگھے کا ایک سرا میری آنکھ میں  
۱۰۰ سے لگ گیا۔ میں نے اپنی ساری جھنجلاہٹ اسی پر  
مل دی۔

”میں ساری عمر تمیز نہیں آئے گی۔ کتنی بار کہا  
کہ یوں چھاپہ مارنے کے انداز میں کرے میں  
امل مت ہوا کرو۔ آنے سے پہلے وستک ریا کرو۔“  
”ایوں جی، آپ کیا کپڑے بدل رہے تھے جو میں  
وارے بجا کے آتی۔ ویسے بھی دروازے تو مہمان  
مالا کرتے ہیں۔ میں کہا اپنے ہی کرے میں مہمان  
نا لزا۔“ اس نے میری آنکھیاں اپنے دوپٹے کا گولا سا بنا  
رکھتے ہوئے دروازہ کھلکھلانے والی ہدایت پر

اعتراف پیش کیا۔ میں پہلے نبی آنکھ کے درد سے بے  
حال تھا۔ اس نبی افتاد پابوکھلا گیا۔ لان کے دوپٹے نے  
گرم مسالوں اور لسین کی بدبو کے بھیکے اٹھ رہے  
تھے۔  
”بیکم ایسے میری آنکھ ہے بربانی کا سچھ نہیں جسے تم  
دم دے رہی ہوں؟“ اس نے میری آنکھ پر رکھے دوپٹے  
کے گولے اپنے لگا کر زور زور سے پھوٹنیں شارنا شروع  
کیں تو میں کہے بغیر نہ رہ سکا۔  
”ابھی آرام آ جاتا ہے ذرا اپنا شوخاپن کنٹول میں  
رکھو جی پکھ دیر۔“  
میری حس مزاح کو وہ بھی شوخاپن قرار دی تھی۔  
اگرچہ اس وقت میں نے ہرگز کوئی لطیف مذاق نہیں  
فرمایا تھا۔ بلکہ آنکھ کے پوٹے کو جس طرح زور سے  
بند کر کے وہ دوپٹے کی مدد سے گرم گرم بھیاپ مسالوں  
کی خوبیوں میں لپیٹ کر مجھے تک پہنچا رہی تھی، مجھے خود  
پہ بربانی کی دیگ کاہی گمان ہو رہا تھا۔  
”یہ دیکھو جی، آجیا آرام۔“  
اس نے میرا چھوڑی سے تھام کر آئنے کے  
سامنے اس انداز میں کیا جیسے کوئی ماہر یو میشن کی عکی  
گزری صورت کو اپنے ہنر کی بدولت اپر اکا روپ  
دینے کے بعد فخریہ انداز میں آئنے کے روپ روکر کے داد  
طلب ہوتی ہے۔ میری دامیں آنکھ میں ابھی تک ہلکی  
سرخی باقی تھی۔ البتہ درد کو آرام آگیا تھا۔ میں نے اپنا  
چشمہ درست کیا۔

پسمہ درست میا۔  
”لو یہ تو بھول ہی گئی کہ بات کیا کرنی تھی۔“ اس نے وہ حرکت کی جو کرنے کی میری ہمیشہ حرست ہی رہی، یعنی کہ ایک زور دار ہاتھ اپنے ہی سر پر رسید کیا۔  
”شکر ہے اللہ کاستے“ میں زیرِ لب بردرا کے اپنا موبائل اور والٹ وغیرہ کوٹ کی جیب میں ڈالنے لگا، آج عرصے بعد میں نے ٹوپیں پہننا تھا اور وہ بھی ڈرائی کلین کروائے۔ ورنہ شلوار قیص پہن پہن کر میرا سر لیا ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔ پینٹ میں یہ آسانی ہے کہ تو ند کش روں میں رہتی ہے۔ زر ایلٹ باندھنے میں دقت ہوئی، ما پیتلون میٹسٹ محسوس رہ ہو۔ تو انسان خود بخود اینے

کھانے پینے پر کنٹول کر لیتا ہے، ما وزن کو دوبارہ پہلے جپیاں پڑی رہتی ہیں، یہ عجیب سارنگ کیون کرالیا ہے۔ والی حالت میں لانے کے ذلیلے جانگ وغیرہ شروع نہ کالائیں چنانہ لال نہ براون۔ کروتیا ہے۔ جب کہ گھیردار شلوار قیص میں یہ وارنگ والی سہولت موجود نہیں۔ دو گز لمبا ازار نہ ہر سائز کی توند کے مطابق ایڈ جسٹ ہو جاتا ہے۔ آج سالوں بعد اسے سنتے دیکے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ میرام رات کیا پکاؤں۔ مسالہ بھری بھندی بینکن کا بھرتا پائے کا شور بایس۔ ”ہاں یاد آیا۔ میں یہ تو پوچھنے آئی تھی کہ آنے والوں بعد اسے سنتے دیکے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ میرام دزن بھی خاصا بڑھ گیا ہے۔ ایک نوزائیدہ سی توند ”جھما“ کر رہی تھی۔ میں نے کوٹ کے نچلے بھی بن بند کر کے اس توند کی پردہ پوشی کی۔ بال بھی اس طریقے سے بنائے کر اسپرے کیا کہ میرا وسیع ہوتا تھا۔ ہک گیا۔ عینک اتارنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ ظاہر ہے وہاں تقریر بھی کرنا تھی۔ ویسے بھی سلو فریم والا یہ چشمہ مجھے سوبر اور حقیقی دانشور ظاہر کرتا تھا۔ خوب رگڑ کے شیو تو میں کرچکا تھا اور کل ایک منگے پیشہ سیلوں سے بال بھی اس انداز میں ڈالی کرواجکا تھا کہ پہلی نظر میں یہ محسوس ہی نہ ہوتا تھا کہ ان بالوں کی سفیدی دھلنے کے لیے اوپر رنگ سازی کی گئی ہے۔ ”پوسہ ہائے“ یہ آپ کے بالوں کے ساتھ کیا ہو گیا جی؟“ نظر پڑتے ہی اس نے تاسف سے ہاتھ ملنا شروع کر دے۔

در میان میں دستی۔  
 ”لگتا ہے تیل کے بجائے فہنمائل یا با تھہ روم  
 دھونے والی پیچ لگالی ہے۔ عینک کے بغیر آپ کو نظر  
 بھی تو ”لکھہ“ میں آتا ہے۔ ہائے پہلے ہی  
 چار بار رہ گئے تھے، ان کا بھی ناس ہو گیا۔ ویکھوڑا کیے  
 نسوار کی رنگت کے ہو گئے ہیں۔ ”اس کی آنکھوں میں  
 آنسے تک آ گئے۔

”تم نے نوار کبھی دیکھی بھی ہے؟“ میں بھنا گیا۔  
 رعنی ”میرا تو رہی ہوں اُن پر لائے رسم پڑھ کر دی جو واقعیت“  
 ”امتحن عورت اُمیں نے بال والی کیے ہیں۔“ میں  
 رعنی اس سے ہاتھ اُن سے پیچھے کر لائے کہ دراصل لیندا چاہا تھا  
 ”تو مجھے کہنا تھا، میرے پاس ہر وقت کالی مہندی کی  
 رعنی رونگوں کی رعنی سر کی رعنی سر کی

اسے پہلی نظر میں دیکھتے ہی یہ تو ثابت ہو گیا کہ  
کتاب پہ چھپنے والی اس کی تصویر وہی پرانی والی تھی  
لیکن اس بات کا اعتراف نہ کرنا زیادتی ہو گی کہ اب تک  
اس کے حسن و جمال میں کوئی کمی نہ آئی تھی لیکن شاید  
ہر عورت کو اپنے اس روپ سے عشق ہوتا ہے، لہ  
روپ جو سولہ سال کی عمر سے اپنیں سال کی عمر تک  
اس پہ چڑھتا ہے، ایسی لیے وہ اپنی حالیہ تصویر کے  
بجائے وہی سولہ سال پرانی تصویر چھپواتی تھی جس میں  
انہارہ انہیں سال کی توثیز غزالہ اپنے نو عمر حسن کی  
ساری دلکشی اور رعنائی سمیٹے ہوئے تھی اور اس وقت

جو غزالہ درخیش غزل میرے سامنے تھی، وہ پسیتیں  
سالہ عورت تھی ایک بھرپور عورت۔

اوچا محسوس کرتے ہوئے خود بخوارانی گردن اکڑا۔  
”اوہ نلک جی! مجھے یقین تھا، آپ ضرور آئیں  
اس کے لابنے اور جتنے ہنگریاں گھرے بھورے

اس نے اپنے دنوں ہاتھوں میں میرا ہاتھ دلوچتے  
ہوئے زمی سے دیا کر کما۔ اس کی ہیرے جڑی پلاں نہیں  
پسختے۔ بالکل سیدھے ہلکے سہری بال اسے بڑی ماڈی  
شہل دے رہے تھے اور جنیں وہ بڑی دبیرانہ سی  
زناکت کے ساتھ بار بار پچھے کی طرف جھینکتی تھی تو ان  
کام مصنوعی سہرا بن اس کی بے حد گوری رنگتیہ بکھر  
بکھر جاتا تھا۔ صرف بالوں کی حد تک، ہی نہیں بلکہ اس  
کے چہرے پہ بھی کچھ مصنوعی چیزوں کا اضافہ ہو جاتا تھا۔  
آنکھوں پہ نیکلواں بال سبز رنگ کے لینس لگتے تھے جو  
اس کی سہری رنگت اور نئے ڈالی شدہ بلونڈ بالوں کے  
ساتھ بلاشبہ بڑے تجھے رہے تھے۔ سلک کی گھرے نیلے  
رنگ کی سازہ میں کے پھسلتے ٹپو پہ بزرد حاگے کے کام  
نے اسے کسی سورنی کا ساپر اہن اور ڈھار کھا تھا۔  
سازہ میں اس کے تناسب سراپے پہ تکنی بھلی لگ رہی

پلے کی نسبت وہ قدرے گداز ضرور لگ رہی تھی  
مگر فرہ نہیں۔ مجھے پہچانے میں اسے وقت نہ لگا۔  
حالانکہ اٹھا رہ سال ملے کے ریجن علی نلک اور آج  
کے اس ادھیز عمر جبکی میں زمین آسمان کا فرق تھا۔  
مسکراہیں تو غالماً ”اس وقت بھی میرے ہونٹوں پہ  
مستغل مکین نہ تھیں لیکن اسے سامنے پا کر کچھ درکی  
ہمہن ضرور ہو جایا کرتی تھیں اور اس کے ساتھ ہی وہ بڑی زناکت  
عرصے سے ایسے عائب تھیں جیسے کوئی نادہنده لاکھوں  
کروڑوں کا غبن کر کے فرار ہو جائے، عمر بھر را تھے  
آنے کے لیے روپوش ہو جائے۔ بال اس زمانے میں

بھی پت جھنڑ کاشکار تھے اور اب تو مکمل خزان کاموں  
تھا۔ میر سعی میں عرض پا تھے پیغم برخیں اسے کراؤں۔ آپ تو خیر کی تعارف یا تعریف کے  
تھیں۔ عینک کامبر میری عمر کے سائز کی طرح بڑھ گیا محتاج نہیں۔ کہ آپ اپنا تعارف ہوا بھار کی ہے۔  
اڑ رنگی رنگت خون جلا جلا کے ہنافولی پڑ گئی تھی۔ سر اسی ائمہ کمان سے ابو مکمل دلبائی سے اچکائے  
اسے باد جو جب وہ نہیں پہچانے میں میری طرف پہنچا۔ ”لیکن آپ سے اپنے چند عنزیوں کا تعارف ضرور  
تو میں رہنے دیوں ان مہمانوں کے سامنے نظر کوئی فٹ سر کراؤں گی کہ یہ ان کی بھی خوش نسبی ہوگی۔ بہت

سے لوگ تو اس محفل میں صرف آپ سے ملنے کے لئے ملے۔ اگرچہ اس کی غیر معمولی پذیرائی  
اشتیاق میں چلے آئے ہیں۔ ”اور اب ہے تو خیفی کلمات مجھے مغور کر دینے کے لیے  
میری پہلے سے اچک آچک کے نکتی گروں مزید باہر کافی تھے لیکن میں تو قر رہا تھا، وہ اپنی تقریر میں ہماری  
نکل آئی۔ مجھے خود پر کسی زر آفے کا گلوں ہو رہا تھا جو واپسی کا جوالہ ضرور دے لی۔ ہمارے  
بونوں کی بستی میں آٹھا ہو۔ مجھے ڈائس پر بلایا گیا تو میں ایک ساتھ تعلیمی مدارج نظرے کرنے کا تذکرہ بھی کرے  
اپنے زیادہ تو خود کو میری ایک بیٹن میں اتنا ٹھیک ثابت کرنے میں مدد کرے  
اپنے کچھ میں گھرے لکھ کر لایا تھا، وہ سامنے بیٹھا اپنی  
مدھر مسکراہٹ مکے ساتھ مجھے مزید بولنے پہ اکسائی ہوتی ہو۔ اس کا ہلکا سا گھٹہ میں نے چائے کے لوازمات  
پہاڑھ صاف کرتے ہوئے کیا۔

”اوہ نلک جی! سمجھا کریں تا میں نہیں چاہتی کہ  
لوگ ہماری دوستی کو کسی اور بتاظر میں دیکھیں۔ آپ  
سے تعلق میرے لیے قابل فخر ہے بلیوی۔ کہنے ہی  
والی تھی مگر اس سے پہلے آپ نے بے تکلفانہ میری  
اور میری شاعری کی جو تعریفیں کیں، ان کے بعد مجھے لگا کہ  
آپ میں نے یہ بات ظاہر کی تو لوگ بھیجیں گے آپ  
نے یہ سب کچھ دوستی کے ناتے کیا اور میں دوستی کی وجہ  
سے آپ کی شرست اور ساکھ کو استعمال کر رہی ہوں۔“  
اس کی وضاحت مجھے بے حد بھائی اور میں زیادہ رغبت  
سے چکن پہنچ کھانے لگا۔ وہ بڑی نفاست سے پچھلے  
پندرہ منٹ سے اپنی پلیٹ میں رکھی ایکمہ چاکلیٹ  
پیشہ کو کتر رہی تھی۔

”جمال تک مجھے یاد پڑتا ہے تمہارے کزن، میرا  
مطلوب ہے شوہر کا نام اخلاق تھا اور تم نے بڑے فدق و  
شوق سے یہ نام اپنے نام کے آگے لگا بھی منظور کر لیا  
تھا۔ یعنی غزالہ اخلاق سے تو کیا اب اپنے شوہر کا نام  
استعمال کرنا ترک کر دیا ہے تم نے؟“

”نہیں۔“ اس نے یکاکی ساری پیشہ اٹھا کے  
منہ میں رکھلی۔ ”میں نے شوہر ترک کر دیا ہے۔“  
”کیا سے؟ کیا مطلب؟“ مطلب واضح تھا، اس کے  
باد جو دیں پوچھ رہا تھا۔ ”لیکن کیا بات ہو گئی، وہ تو تمہارا  
فرست کزن تھا۔ بڑا کامیاب انجینئر تھا، معقول  
مالازم تھے۔“

”مگر وہ خود خاصاً نامعقول ثابت ہوا۔“ اس نے  
بیزاری سے میری بات کا۔

”غزالہ! غزل در خشال۔ جس کا نام ہی غزلوں  
کا رد ہم اور ننگلی سمیٹنے ہوئے ہے۔ اس کا فن  
شاعری کی جس زد فضامیں ایک خوشگوار ہوا کا جھونکا  
ہے۔ بھار کی جانب لکھنے والا دریچہ ہے۔ اس کی  
شاعری میں رنگ ہیں، خوبیوں ہے، راتوں کی گیبیہر  
خاموشی ہے، شاموں کے سرمئی سائے ہیں، صبحوں  
کے اجائے ہیں، ستاروں کی جگہ گاہت ہے، چاند کی  
زماہت اور سورج کی گمراہت ہے، پھولوں کی سی  
لطافت اور جھرنوں کی روائی سے۔“

میری اس پر جوش تقریر کے جواب میں وہ شرمائی  
شرمائی کی تلیاں، بھائی اور گردبیٹھے لوگوں کے تو صیفی  
کلمات کو پسہلا ہلا کے قبول کرتی رہی۔ میرے بعد اس  
کی باری تھی۔

”ریحان علی نلک ہمارے ملک کے گراں قدر  
ادب، ہمارے بے حد قابل احترام صحافی اور بے حد  
خوبصورت لب و لبجے کے شاعر، میری بے حد خوش  
نیبی ہے کہ وہ مجھے جیسی نو آموز شاعرہ کے بلا نے پہ  
نہ صرف اس محفل کی رونق بریخانے آئے بلکہ ایک  
ابھرتی ہوئی شاعرہ کی حوصلہ افزائی بھی کی۔ ان کا میرے  
کلام کو پسندیدگی کی سند عطا کرنا میرے لیے ایک اعزاز  
ہے۔ وہ شاعر، جس کی کتابیں میرے سرہانے کے شیخے  
موجود رہتی تھیں اور جس کے افسانے مجھے جیسی پچھی غر  
کی لڑکی کو ایک نئے جہانوں میں لے جاتے تھے، اس کا  
میری کتاب کے بارے میں ایسے کلمات کہنا میرے  
لیے کسی سرمائی سے کم نہیں۔“



میرے کالموں کے انتخاب پر اس نے سیر حاصل کر تھوڑے

کر کے میرا جی خوش کر دیا۔ یہ وہی کالم تھے جن کو بھی  
کبھار سرسری سا پڑھنے کے بعد آرزو سر جھنک کے  
کما کرتی۔

”اس کو کہتے ہیں۔ سانگزرنگیا، لکیر سینتے رہ گئے۔  
بھی جو کھڑا کر دوئیں دن پہلے ہو گیا ہے۔ جاہے بر اتحا،  
جاہے چنگا، اب اس پر افسوس یا خوشی والا کام لکھنے کا کیا  
فائدہ۔“

”تم نہیں سمجھو گی احمد عورت! اے تجزیہ کتے  
ہیں۔ معاشرے میں ہونے والی خرابیوں کی نشاندہی ہم  
خود کو گھرواری کے جھمیلوں میں ہم نہیں کرتیں بلکہ  
اپنا ذاتی شخص بھی برقرار رکھتی ہیں اور اپنے مل  
بوتے پر اپنی پیچان کرتی ہیں۔“

”یہ تو دادی“ (خت کیر) سا سوں والی عادت ہے۔  
”کہتی“ (لاکا) قسم کی نندوں والا کام۔“

ایک بار پھر اس کی بے سروبا باتوں نے اس

خوبصورت گفتگو کامرا کر کر دیا۔ اس سے اگلی ملاقات ایک اور ابی محفل میں ہوئی  
جس میں اس کی شرکت میری وجہ سے ہی ممکن ہو سکی۔ کب ہوئی تھی تمہاری  
ذہنی ہم آنکی نہیں ہو سکی۔ اس سے شادی۔“

”بارہ سال پہلے“  
”بارہ سال کا عرصہ، بہت ہوتا ہے کسی کو جانے اور  
پکھنے کے لیے۔“

”دنیں فلک جی! اگر کسی کو جانا ہو تو ایک لمحہ کافی  
ہے اور اگر کسی سے مزاج کے ستارے نہ ملتے ہوں تو  
پاس۔ نہ دولت کی کی تھی نہ آسائشوں کی۔ پورا  
پیلس بنارکھا تھا ہم لوگوں نے وہی سر اتحاد نہیں لگتا۔“

میں نے تائید میں سر لیا۔ آرزو سے میری برسوں  
پرانی رفاقت اس کا ثبوت تھی۔ ہم دونوں ندی کے دو  
کناروں کے طرح عرصے سے ایک دوسرے کے  
ساتھ تھے۔ ایک ہی منزل پر گراں الگ۔

”ایک بات تو بتاؤ غزن، ادوست ہم سب میں بھی تھے، ترالگا،“ ”بارہ سال کیا چیزیں؟“ اسی لیے میں نے بارہ سال  
اب بھی ہیں پھر لیا وجہ ہے کہ پہلے میں صرف ریحان  
اور تمہارا کر تھا، اب نلک جی اور اپنے ہو گیا ہوں۔ ”ترالگا“  
میں نے تکف کی یہ دیوار کرالی چاہی۔ علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ ہماری اندر اشینڈنگ نہیں  
(زیر ترالگا کیوں، کہاں آئیں سب) ہم میں کچھ تھے، ”ایک نہ بھتی ہو سکتی تھی۔“

”اوے وہ جو تم کہہ رہی تھیں کہ پہلے پاعجمی کے پاش پنڈی چلتے ہیں، ان کی ودی  
تمہارے شوہرنے لاہور میں بزرگی میں سیٹ کرنے کا۔ گذنی میں سارے ”جی،“ (لوگ) پورے۔ آجائیں  
پروگرام پہنایا ہے۔“

”ہاں تو شوہر کیا صرف سیٹھے باٹلی والا، ہی نہ سکتا۔“ پوچھا۔  
ہے۔ میرے کرنٹ شوہر کا نام آغا غفور ہے۔ بہت پوچھا۔

بڑے کنٹر کر ہیں۔“ ”آج وہ گھرے جامنی اور زرور پرنس کے لان کے  
”وہ سیٹھے آنکی۔“ اور میرا دلی اس تسلی ”سی۔“ سوت میں پہنے مجھے معمول ہے زیادہ بڑی لگ  
کر رہا تھا۔ کیا کمال کی رفتار تھی اس عورت کی کیا رہی تھی۔

”چارہمارے“ ”جی“ اور باقی تو ”جی“ پاعجمی ہو را  
کے۔“ ”ہم فیملی ٹرپ پر جا رہے ہیں، اس میں پاعجمی  
ہو را کے۔ میرا مطلب ہے ان لوگوں کا کیا کام۔“  
”وہ بھی تو ہماری فیملی ہی ہوئے۔ آپ کے دوڑے  
پائی ہیں وہ۔“

”مری کے پچھواڑے رہتے ہیں وہ۔ ان کے لیے  
نی چیز نہ ہوگی۔ وہ تو جاتے ہی رہتے ہیں۔“ میں نے  
بد مزکی سے کہا۔ بھائیوں سے میری وابستگی ہمیشہ سے  
وابحی تھی اور پڑے بھائی نے جب سے پنڈی میں  
رہائش اختیار کی تھی، ملنا ملا ناکم ہونے کی وجہ سے یہ  
برائے نام وابستگی بھی نہ رہی تھی۔ پچھلے دو تین ساٹوں  
میں ان کے یوں بچے لاہور آئے تو ایک آرہ روز  
ہمارے یاں بھی رکے ان کی یوں کی آرزو سے خوب  
بنتی تھی مگر میں کسی کام سے اسلام آباد گیا بھی تو  
پنڈی چاکر بھائی سے ملنے کا تردید نہ کیا۔ ہاں چھ ماہ میلے  
جب ایسیں فانج کا ائیک ہوا تو میں ضرور عیارت کے  
لیے گیا تھا لیکن اس کے بعد فون کر کے بھی خیرپت  
و ریافت کرنے کی تیقین نہ ہوئی۔ دیے اس کی خاص  
ضرورت بھی نہ تھی۔ سارے خاندان کی روپورٹیں  
پہنچانے کے لیے میری نصف بھتر کافی تھی۔ دنیا جہاں  
کے مرد گھر آنے کے بعد اُنہیں آن کرتے ہیں۔ بیلی  
کی، این این اور پرائیویٹ چینلز کے ذریعے حالات  
حاضرہ سے آگئی حاصل کرتے ہیں لیکن میں  
بد نصیبی میری قسمت میں آرزو تھی۔ جسے میں  
آن نہ بھی کرتا تو وہ مجھے دیکھتے ہی خود بخود آن بلکہ چاہو

”اوے آثار پکھہ بھتر ہی ہیں۔ ایک پچھوٹلی آغا  
صاحب کو مجھے سے محبت پکھہ زیادہ ہی ہے، اس لیے اندر  
اشینڈنگ کی کمی وہ اس سے پوری کر لیتے ہیں۔ یعنی  
میری باتیں بے شک وہ اس سے اختلاف رکھتے  
ہوں، ابے چوں و چراہن جاتے ہیں، ورنہ اخلاق اور  
سیٹھے باٹلی والا۔ وہ ہریات کو ان کا مسئلہ بنانے تھے  
پیسکل میں۔ میں نے ان کی اتنا ان کے پاس رہنے  
دی اور اپنی انا بحفاظت سمیٹ کر الگ ہو گئی۔ وہ بھی  
خوش میں بھی خوش۔“

\* \* \*

”یا! کتنے دنوں سے ہم آؤٹنگ پر نہیں گئے۔“  
باناں نے میری سوجوں کا تسلی توڑا۔ میں نے ایک  
پیار بھری نظر اپنی لاڈلی بٹی کے کھلے کھلے چڑے پہ ڈال۔  
”بیٹا جان! آپ کے سسٹر ہو رہے تھے، اس لیے  
اپنا فری ہو جاؤ پھر پروگرام پہناتے ہیں۔“

”یا! کیوں نہ ہم مری چلیں؟“ میرے بیٹے نے  
نیڈیا پیش کیا۔  
”ہاں یہ تھیک ہے۔“ آرزو فوراً ”متفق ہو گئی۔“

ہو جاتی اور سارے خاندان، دور پر تے کے والفت۔ ہی مجھے اپنی گزشہ دنوں کی سرگرمیوں پر دقت رے کاروں، محلے داروں سے لے کر کام والی ماں تک کے شرمندگی سی محسوس ہوئی۔ جن کے زرزیعے میں غزالہ حالات زندگی کے تازہ ترین ساختوں اور تبدیلیوں سے درختان غزل سے تعلقات استوار کرنے کی بھرپور مجھے باخبر کرتی ہے۔ بس نہ کہتی تھی تو اپنی نہ کہتی تھی۔ کوشش کر رہا تھا۔ کبھی دبزپہ انوائٹ کر کے، کبھی بکس فیٹر پہ چلنے کی دعوت دے گرتا۔ کبھی کسی کی کافی ہاؤس میں میری لانہ سنتا۔

”بھی تو کسی دوسرے کے بارے میں بھی سوچ لیا: م بلا کر اس سے خوبصورت گفتگو کے دوران میں نے کریں۔“ اس نے ہاتھ انچایا۔ تھیشہ خود کو پکیش سالی نوجوان مجسوس کیا۔ ان بظاہر ”پاء جی جب سے بیمار ہوئے ہیں ان کا سارا اثیر کتنا بے ضرر کی دوستانہ ملا قاتلوں کو خواخواہ ہی رومائی رنگ پریشان رہتا ہے۔ ایک تو یہی وہ دوسرے شر رہتے دے کر خود ہی اپنی تسکین کرتا رہا۔

”ہماری بھی لمحتی ہے تو ضرور چلیں گے“  
 ایسا کہتے ہوئے میری اچھتی ہوئی نظر آرزو پہ گئی تو  
 مجھے اس کا چھرو بھٹتا ہوا محسوس ہوا لیکن میں نے اسے  
 وہم سمجھ کے جھٹلا دیا۔

”وہ بھلا اتنی حاس کب سے ہونے لگی۔ اس کا مود اس بات پر تو ہرگز خراب نہیں ہو سکتا کہ میں اسے اہمیت نہ دوں۔ اسے ان باتوں کی پرواہی کب ہے۔ ہاں، چاول اپنھے نہیں نکلے، دم دینے کے باوجود نرم پڑ کئے۔ خریزوہ پھیکا نکلا، کالا زرہ مزید منگا ہو گیا۔ آپاں صغاراں نے پوتی کارشٹے طے کرتے ہوئے اس سے مشورہ نہیں کیا۔ نئے ہمسائے بڑے روکھے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ ان مسائل پر وہ بخوبی ہلکان ہو سکتی ہے۔

پریشان رہتا ہے۔ ایک تو ویسے ہی وہ دوسرے شر رہتے ہیں، ساری براوری سے کٹ کر۔ ان کا کاروبار تو ان کے بڑے لڑکے ساجد نے سنبھال لیا ہے، حالانکہ وہ دچارہ تو خود ابھی ”منڈا کھنڈا“ (لڑکا بالا) ہے۔ ابھی اس کے یہ سب کرنے کے دن نہ تھے۔ باقی بچے پڑھنے لگئے والے، باپ کی بیماری سے سُم سے گئے ہیں۔ ایک تو ہمارے جانے سے ویسے ہی انہیں اچھا لگے گا اور اگر ہم مل کے سیر کرنے جائیں گے تو ان کا جی اور بھی بھل جائے گا یا عجی بھی خوش ہوں گے۔

”اور تم اور بڑی بھاگی تو ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کے  
کیکلہ، ”والوگی۔ اللہ ملائی جوڑی۔“

”ہائے“ اب میری عمر کیکلی ”ڈالنے کی ہے۔  
مجھے شوق نہیں کڑی بن بن کے دکھانے کا۔ ماشاء اللہ  
جو ان بچوں کی ماں ہوں۔ پتھر میرے ”موندوں“  
(شانوں) برابر آگیا ہے۔ میں ان شوخیوں میں سے  
نہیں جو ”چٹا جھاتا تھے عقل دا گھاتا“ پہ عمل کرتے  
ہوئے ”بڑھی گھوڑی لال لگام“ بنی پھرتی ہیں۔  
”اوہ ماما! آپ دونوں کس بحث میں لگ گئے۔“  
میرے بیٹے نے اٹتا کر کہا۔ البتہ بیٹی کسی گھری سوچ  
میں کم نہیں۔

”پیا! آئی تھنک کہ ماما ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ہم  
مری بے شک نہیں جاتے لیکن بڑے پیا کے ہاں  
(ضرور گوئی جانالی جا سبھے شے) میں اسے غور سبھے اسے تو پکھا۔  
اس کے وہ نہ ہے بست بڑی بڑی بست بجھہ داری کی  
(زہر) شاید آرزوی پھیکلی لہیں اسے خوازی ہے زیبچے اب  
بڑے ہو گئے ہیں۔ ”میں نے سوچا اور اس کے ساتھ  
(زہر) تھیں اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے

”اُجی سنتے ہو!“  
 گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے میں نے اس کی آواز  
 سنی۔ وہ سرسریہ مہندی کالیپ کے چل گھستی میرے  
 پیچھے ہی نکل آئی تھی۔

”آپ سے کچھ منگانا تھا۔“ وہ روپے کا پوکھول کے  
کچھ نکالنے لگی۔

”پیے میں جی! یہ ”ٹیکریں“ ہیں۔ ان کے رنگ کے وھاگے لادیں۔“ اس نے چند دھجیاں سی پلوسے کھول کے میرے آگے لہرائیں۔ میرا خون کھول کے

رہ گیا۔

”کے رنگ کے ہوں، اصلی پری کی نکلی لانا۔“  
”اصلی پری یا نفلی پری۔ میں یہ خرافات نہیں  
لاسکتا۔ سبزی گوشت کے بعد اب تم مجھے سوپاں  
دھاگے خریدنے کی طرف لگانا چاہتی ہو۔ آرزو بیٹم!  
تمہارا دماغ خراب ہو چکا ہے۔ میں ریحان علی فلکی  
یہ سب خریدوں گا۔ یہ درزیوں والا سامان۔“  
”آپ ہر یار مجھے اپنا نام کیوں بتاتے ہو۔“ اس نے  
دعا برہ پیوش بڑی سی گردہ باندھ لی۔

”میں تے نال سنی۔ میرے کوئی پیر نہیں ٹوٹے  
ہوئے، تکڑ کی دکان سے آپ جا کر لا سکتی ہوں۔ یہ تو  
مندی تھی، ہوئی ہے، اس لیے آپ سے کہہ دیا۔ کوئی  
بات نہیں، میں چادر کی بکل مار کے لے آؤں گی۔“

”ہاں جانا ضرور ہے۔ اتنا ضروری کام نہیں یہ  
دھاگے وغیرہ لانا۔ خبردار جو اس بے کار حلے میں باہر  
نکلیں۔“ میں نے ناپسندیدگی سے اس کے بالوں کو  
دیکھا، جن لپ پتازہ گھلی گاڑھی گاڑھی بدرنگ اور بدبو

پینچ گیا۔ حسب توقع انہوں نے میرے لئے لینے میں  
تک آرہی تھی۔ اور بیل ایک بدوضج جوڑے میں لیٹے  
تھے۔ کل کا دھولا چڑھن کی کھانی کہہ رہا تھا۔ پینچ  
کرنا نئے بالوں کی وجہ سے اس کی چند ہمی چند ہمی  
آنکھیں بالکل منگولیہ نسل کی جنگ جو شہزادیوں جیسی  
لگ رہی تھیں۔ جامن چوس چوس کر کھانے کی وجہ  
سے ہونوں پہ ان کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ کل والے

ابھی میں شرمند ہونے کی ایکنگ کرنے ہی والا تھا  
کہ وہ بھولپن کی ایکنگ کے تمام ریکارڈ توڑنے لگیں۔  
کل رائستہ گر جانے کی وجہ سے تبدیل کرنے کی زحمت  
کر لی گئی اور سبز رنگ کی اس ڈھیلی قیص کے اوپر  
اس نے پرانا سا ایک چھپا ہوا تویلہ شانوں پہ ڈال رکھا تھا  
ماکہ مندی قیص پر گر کے نشان نہ چھوڑ جائے۔

”تو ہے!“ اس نے ماٹھے پر پاہنچ مارا۔ ”چھاہر بن، بیٹر، زندہ سلامت بیٹھی ہوں، خوانخواہ تھیں چکر رہا۔“  
”تو یہ جائیں گے، رہ لیں گے،“ اس کے پاس سر کر رہا تھا۔ ”آپ کے شرمندگی واقعی  
”اب سے کیا بلائے؟“ میں نے بلا سکتے کے اس ایکسر ایکسپرے اندر رعود کرائی۔

”آپ کے اچارے ہے۔“ اس کے پاس سر کر رہا تھا۔ ”آپ کے خافغا سے چرے پر ایکدم ٹھنڈی میٹھی  
رکھ رہیں گے،“ اس کے پاس سر کر رہا تھا۔ ”آپ کا جواب پنچ کے لیے رک

مکراہٹ سکون سے پھیل گئی۔ میں سوچنے لگا یہ اچار۔ اس طرح غائب ہو جانے کا مطلب تھا اس ڈرامے کے  
سے ان کا لیل لگاؤ ہے یا آرزو کے نام کا ابجائز جواب۔ دو راتیں کمزید طویل کرتے۔ حسٹر نے  
انہوں نے خودے دیا۔ ”پہاڑیں تیری کون ہی نیکی اللہ کو پسند آگئی یا اللہ  
”بھیتی رہے ہماری بھرجائی۔“ ان کی آواز گلوکیرا۔ بخشش اماں جی، ابا جی کی دعا میں کام آئیں۔ جو تیرے  
ہوئی۔ ”یہ کام تو آرزو ہی کر سکتی تھی۔ یہ اس کی ہی نصیحت میں آرزو بھیتی گھر خوڑنے والی عورت آئی۔ یہ  
محبت ہے کتنا خیال ہے اسے اس بھن بکے جذبات نہ اس کے کرم ہیں جو تو خاندان سے جزا بیٹھا ہے ورنہ  
کا۔“ اس کے لیے تیرے کرتوت ایسے نہیں تھے جو کوئی تیرے ساتھ  
”اب ایسا بھی کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا اس نے،“ تعلقات برقرار رکھ پاتا۔ اور وہ اس کے بھی کام وہندے  
خود جی بھر کے چھوڑی ہے۔ سارا سال ہی چھٹیاں اچار، مرتبے، مرتبان بھر بھر کے ڈالتی ہے۔ یہ پاؤ بھر کا آپ  
کے لیے بھیج کے ایسا کیا تیر مار ڈالا اس نے۔“

”بات اچار کی نہیں ہے رہ جان،“ اسے جھٹلے! یہ  
اچار تو زرا بھانہ ہے۔ پرسوں ہی فون پہ اس سے بات  
ہوئی۔ تیرے لیے بڑی اداں بھی میں اور آرزو۔ وہ تو  
دلوں میں اترنے کا فن جانتی ہے۔“

”چھا آے آے“ میں نے حرث سے اس  
ائکشافیہ نہ بولند کیا۔

”اور گیا۔ دیکھ۔“ اس اچار کے بھانے تھے  
یہاں بھیج دیا۔ میرے دل میں ٹھنڈ پڑ گئی۔ تجھے کیا پتا،  
ہل جائے کا سایہ بھی نظر آئے تو ہنوں کو کتنا سکھ ملتا  
ہے۔ اک سات سمندر پار بیٹھا ہے، دو جا پندھی جاسا،  
لیکن پچ کھتی ہوں، وہ اتنے دور نہیں لکھتے۔ جتنا تو لگتا  
ہے۔ ایک شر میں رہ کر بھی تو نے خود کو کتنا الگ کر لیا  
ہے۔“

”بس آپسِ ام صوفیت۔“

”رہنے دے، رہنے دے۔“ وہ جو وہ سرے ملک  
سے میںے بعد فون کرتا ہے۔ پانچ سات منٹ کی کال  
میں اتنا دل ٹھنڈا کروتا ہے۔ اور تو جارے رہ جان!  
تجھے تو نہ رستے نہ جانے آئے نہ محبت جاتی آئی۔“ وہ  
دو پیٹے کے پوچھے آنکھیں پوچھنے لگیں۔ ان کی  
بھوتابندہ میرے لئے شرپت لے آئی۔ میرا قطعی مود  
نہ تھا۔ کچھ وہ اور بیٹھ کیہ شرپت میںے کا۔ بلکہ میرا  
اراہ تو کھڑے گھرے سلام کر کے اچار تھما کے واپس  
جاپنے کا تھا۔ لیکن اسی چندیاں بھر بھر انڈیلی جا رہی تھیں۔  
لاشیوری طور پر میں آپا کا جواب پنچ کے لیے رک

ہمیشہ کی طرح آج بھی میں ان کی زبانی ”آرزو نامہ“  
من کراوب گیا۔ سر جھنکتے ہوئے میں اٹھ کھرا ہوا۔  
”اچھا آپا! میرا خیال ہے، میرے آنے سے آپ کو  
مایوس ہوئی ہے۔ آرزو کو ہی آنا چاہیے تھا۔ شاید مکپ  
بھی خوش ہو شکر۔ چلتا ہوں۔“ وہ تاسف بھری  
نظریوں سے مجھے دیکھتی رہیں۔ ان کی بھوفرا“ پکن  
سے نکلی۔

”ماموں جانی! جانے پی کے جائیے گا۔“

”پھر کبھی سی۔“ میں مالتا ہوا راہداری کی جانب مڑ  
گیا۔ پیچھے سے تابندہ کا حیران ساتھیہ سنائی دیا۔

”ممالی کتنی محبت کرنے والی، تکنی پر خلوص سی  
ہیں۔ ماموں جیسے روکھے پھیکے اور خلک مزاج انسان  
سے کیسے گزارا ہو جاتا ہے ان کا۔“

اس سوال پر میں ترپ، ہی تو گیا۔ سخت ناصافی تھی  
یہ، بجائے اس کے کہ مجھ سے ہمدردی جاتی جاتی کہ  
میں اس کے ساتھ گزارا کر رہا ہوں، الٹا ممالی صاحبہ پر  
ہمدردی کی بالشیاں بھر بھر انڈیلی جا رہی تھیں۔  
لاشیوری طور پر میں آپا کا جواب پنچ کے لیے رک

(بھو) خیر سے دوچھ جی کو ہے۔ کہہ رہی تھی۔ مای جی!  
آپ کے ہاتھ کا اچار کھانے کو دل کر رہا ہے خاص  
اس کے لیے بنایا ہے، ضرور دے کر آتا۔“ اس نے  
میری بڑی بہن کا نام لیا۔

”ایک تو تمہارا یہ ”سوشل ورک۔“ نہ چاہتے  
ہوئے بھی میں نے وہ جار تھام لیا ویسے بھی آج میں  
پہلی بار غزالہ کے گھر حارہا تھا اور اس کے گھر یعنی  
ڈیفیس جاتے ہوئے راستے میں فردوں مار کیٹ تو  
آئی، ہی تھی۔ جہاں آتا ہتھی تھیں۔ البتہ یہ کہا مشکل  
تھا کہ تپا میری جان بچنے میں کتنی دریکھاتی ہیں۔ میں  
ان کے ہاتھ کم ہی آیا کرتا اور جب آجاتا تو پھر اتنی  
جلدی وہ مجھے اپنے شکنخ سے نکلنے نہیں دیتی تھیں۔

”بعد میں جاؤں گا تو غزالہ کے ساتھ گزارے  
حسین لمحات کا سرور وہ بھک سے اڑا کے رکھ دیں گی۔  
بہتر ہے، پہلے ہی اپنا خون جلا لوں بعد میں افاقہ تو ہونا ہی  
ہے۔“ میں نے ناپسندیدگی سے اس کے بالوں کو  
دیکھا، جن لپ پتازہ گاڑھی گاڑھی بدرنگ اور بدبو  
دار مندی نہیں کیں سے بُنک کے کانوں اور ماتھے  
تک آرہی تھی۔ اور بیل ایک بدوضج جوڑے میں لیٹے  
تھے۔ کل کا دھولا چڑھن کی کھانی کہہ رہا تھا۔ پینچ  
کرنا نئے بالوں کی وجہ سے اس کی چند ہمی چند ہمی  
آنکھیں بالکل منگولیہ نسل کی جنگ جو شہزادیوں جیسی  
لگ رہی تھیں۔ جامن چوس چوس کر کھانے کی وجہ  
سے ہونوں پہ ان کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ کل والے

ابھی میں شرمند ہونے کی ایکنگ کرنے ہی والا تھا  
کہ وہ بھولپن کی ایکنگ کے تمام ریکارڈ توڑنے لگیں۔  
کل رائستہ گر جانے کی وجہ سے تبدیل کرنے کی زحمت  
کر لی گئی اور سبز رنگ کی اس ڈھیلی قیص کے اوپر  
اس نے پرانا سا ایک چھپا ہوا تویلہ شانوں پہ ڈال رکھا تھا  
ماکہ مندی قیص پر گر کے نشان نہ چھوڑ جائے۔

”تو ہے!“ اس نے ماٹھے پر پاہنچ مارا۔ ”چھاہر بن، بیٹر، زندہ سلامت بیٹھی ہوں، خوانخواہ تھیں چکر رہا۔“  
”تو یہ جائیں گے، رہ لیں گے،“ اس کے پاس سر کر رہا تھا۔ ”آپ کے شرمندگی واقعی  
”اب سے کیا بلائے؟“ میں نے بلا سکتے کے اس ایکسر ایکسپرے اندر رعود کرائی۔

”آپ کے اچارے ہے۔“ اس کے پاس سر کر رہا تھا۔ ”آپ کے خافغا سے چرے پر ایکدم ٹھنڈی میٹھی  
رکھ رہیں گے،“ اس کے پاس سر کر رہا تھا۔ ”آپ کا جواب پنچ کے لیے رک

گیا۔

”بس تابندہ! مقدروں کے کھلی، رب سو ناجانے کس کام میں اس کی کیا مصلحت ہے۔ میں ابھی اپنے دیر کے اچھے نصیبوں کا شکر ادا کر رہی تھی، شاید اس جوڑی مانے کے پچھے اللہ کی بھی مرضی ہو کہ اس شکرے انسان کی زندگی آرزو جیسی عورت کی وجہ سے سونو جائے لیکن آرزوی اس بھلی عورت کو کیا ملا۔“

مُسْكَرَا يَا تَوَسْعَ  
سِرْزَهَ دَانَتْ اُورْ پَيْلَهَ مُسْوَرَهَ دَيْلَهَ كَرْجَهَ اِبْكَانَى سِ  
أَنْجَنَى۔

”تَشْرِيفَ رَكَبِيْهَ۔“ اس کی آواز اس کے بچتے سے قطعی مطابقت نہ رکھتی تھی، منحنی سی، منمناتی ہوئی کسی خوفزدہ نوزادیہ سینے جیسی۔

”دُجَالَهَ آپَ كَارِبَازَ كَرَتَى سَـ۔“

”جی، بُسْ ذَرَهَ نَوَازِيْهَ هَـ۔“

”سَـ هَـ آپَ بَهِيْ شَاعِرَ مَـ هَـ، كَـ تَـ وَ تَـ لَـ كَـ هَـتَـتَـهَـ“  
کوئی نہ بھائیج کے لیے ایسے جذبات رکھ سکتی ہے جیسے آپ کے ہیں۔ اگر مماثل جان کو اتنی محبت ملی ہے تو یہ بھی ایک طرح سے ان کے خلوص اور بے لوث محبت کا صلسلہ۔“

اس سے زیادہ سخنے کی مجھے میں تاب نہ تھی۔ میں فوراً باہر نکل گیا۔

\* \* \*

ڈنیش کے 7 بلاک کا سب سے عالیشان بنگلہ غزالہ کا تھا۔ مجھے اپنی سینکند پینڈ سوزوکی اس کے بڑے سے منقش عالیشان آہنی گیٹ سے اندر لے جاتے

ہوئے شرمندگی سی محسوس ہوئی۔ پوری ٹیکو میں مر سڈریز، ہندناکارڈ اور مزداہائٹ چم چم کرنی شکارے مار رہی تھیں، لش گرین لان میں سنگ مرمر کے بنے پینچ، چنبرہ اور شید لئے تھے۔ مصنوعی آبشار بھی تھی میں مرغوب ہوتا اندر داخل ہوا۔ آراستہ و پیراستہ کو رویڈر سے لے جاتے ہوئے ملازم نے مجھے ایک

سچے سچائے لاؤچ میں لاٹھایا۔ میں ایک بیش قیمت دیپز صونے میں دھنسا سامنے کی دیوار میں نصب سائٹ ارج کی اسکرین پر انڈیا کستان کا تیچ دیکھ رہا تھا۔ جب آغا غفور کی آمد ہوئی۔ وہ ایک پستہ قائمت فرقہ انڈام اور اتفاقیہ بانجنا ادھیز عمر رحیف کے تھا۔ یقیناً بوجھ کے بھی دین کی نیز سے جگانے کی جرأت مت کیا کرو۔“

بارہ سال پہلے کی پیداواریسے اس کی توند میری منی کی لشکر کے مقابلے میں اپنی بھی وحیانی کی کمی کی باری کی توند ہیوں سے کچھ لادھنے کی آواز آئی، شاید کوئی گلاس، مکو غیرہ تھا۔

حیثیت میری مخدوش حالت سے بہرہ کے بھی۔ وہ ”بی بی! صاب نے بولا تھا۔“ ملازمہ کی سمی ہوئی

”لَـمَـامَـ كَـمَـاــ“؟ اس آواز پر میں نے چونک کے گئیں سے تم نے آج پھلک صاب کو گھر لایا تھا۔ اچھا تو نہیں للتا“ سہمان بیٹھا ہے اور میزان گائے۔“ اس نے ڈر کے یاؤں تک سمیت کے صوفے پر کر لیے۔

تب مجھ پر امکشاف ہوا کہ روکے بھرے بالوں والی،

پھٹکی رنگت پر بد نما جھائیوں والی، سوچی ہوئی بے

کرتش گد لائی آنکھوں کے پیچے سیاہ حلقوں والی اور

کرخت آواز میں انتہائی بھونڈے طریقے سے چلاتی ہوئی یہ عورت غزالہ درخشاں غرل ہے۔

وہ غزالہ جس کی ہر برادر اسیں غزل کا ساما نکپن

ہے۔ جس کی لوچ دار آواز میں گیتوں کا ترنم۔ جس کے

کے خوابناک لمحے میں انظم کی سی زراکت۔ جس کے

اپردوں کی خفیف سی جنبش بھی ہزار فسانے کہہ ڈالتی

ہی۔ اس کے وہی ابرواس وقت آنکھوں سمیت ماتھے

سے بھی اوپر جائے تھے۔ وہ جس کی دھیمی دھیمی

مسکراہٹ شاعرانہ تخلی کی مکین لگا کرتی تھی، اس

وقت شعلے بر سارہی تھی۔ اس نے رخ موڑ کے مجھے

ویکھا۔ اچانک اس کے چہرے پر زردست تغیر پیدا ہوا

اور وہ ”ایکسکیووی“ کہتی واپسی مڑ گئی۔ آغا غفور

نے کھیانی سی مسکراہٹ کے ساتھ وضاحت پیش

کی۔

”اپنی گجالہ گستے کی ذرا تعالیٰ ہے۔ آئے گئے کا بھی  
لماج نہیں کرتا۔“

”میرا خیال ہے، مجھے چلتا چاہیے، شاید غزالہ

صاحبہ کی طبیعت تھیک نہیں۔“ مجھے خاصا بر امhos

ہوا کہ وہ مجھ پر توجہ دیے بغیر واپس لوٹ گئی۔“ وہ چیونگم

چباتی سے بغیر کسی سلام دعا کے تکلف میں پڑے باہر

آواز پر میرے سامنے بیٹھئے، آغا غفور کی سیاہ رنگت،

ایکدم میالا پڑ گئی۔ اس کے جامنی، ہونٹ زرد ہو گئے۔ آپ کو دیکھا نہیں، سوریہ تھے اس نے آنکھوں لاؤچ کا پردہ ہٹا اور ایک بھرے بالوں والی غضب تاک۔ میں وہ نہیں لگائے تاک۔ میں وہ کیا بولتے ہیں آپ لوگ عورت پھنکا رتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔“

”کیا تکلیف تھی تھیں غفور کے بچے، کتنی بارہ کہا۔“

”ہاں پہلے تو چشمہ و شہر لگاتی تھی۔ راب کمال

ہو جایا کرو۔ سارا دن میرا خون جلانے کھر میں دندناتے

اے اے ان چشوں کا سال باک تھیں تیر دھیں

بھرتے ہو۔“ وہ مددیاں بتچے اس پر چلا رہی تھی۔

”ہاں بھائی ہے اس پر چلا رہی تھی۔“

”لماج نہیں کرتا۔“

”اوٹنگ پر تھیں تھیں۔“

”اوٹنگ پر تھیں تھیں۔“</

نکل گئی۔ میں نے تعارف جانا چاہا۔  
”بھی ہے ہماری۔“ وہ اپنے گلے سڑے دانت  
دکھاتے ہوئے مسکرا یا۔

”لیکن وہ تو آپ کو انکل۔“

”ہاں بھی ہے نال میسے بھی مل سے میرے کو پیا  
نہیں ماناسیہ اصل میں گجالہ کے پہلے والے پسینہ  
سے۔“

”رہے نال تم وہی اجڑ کے اجڑ، یعنی اگر کسی کو لمحہ پر  
انوائیٹ کیا جائے تو جائے کا تکلف اضافی ہوتا ہے۔“  
”پلیز، غزالہ۔“ عزت افرالی آغا صاحب کی  
ہورہی تھی، چہہ میرا سخ پڑ گیا۔ میں نے اسے مزید گل  
افشانی سے باز رکھنے کی کوشش کی۔

”جاوہر نہ ہو، پکن میں کیا ہو رہا ہے۔ راست کو میں سنے  
جو جو کہا تھا، تھیک وہی کچھ بن رہا ہے یا نہیں؟“ اس سکل  
نے خوت سے اپنے سرتاج کو ہاں سے چلتا کیا۔ اس  
کے غائب ہوتے ہی غزالہ نے ”ہونہ“ کہہ کر زور  
سے سرجھنکا۔ لمحہ بھر کی دیر تھی، اس کی ناگوار تیوریاں  
پھر سے غائب ہو گئیں، چرے پہ میٹھی مسکان اور لمحے  
میں شیرنی پھر سے کھل گئی۔

”تو یہ ہے تمہاری اندر اسٹینڈنگ“ میں نے کریدا۔  
”ہاں شکر ہے اللہ کا، گزارا ہو رہا ہے۔“ اس نے  
صبر و قناعت کی دلیوی بننے کا مظاہرہ کیا۔

”کون کہتا ہے کہ آج کی عورت سمجھوتہ نہیں  
کر سکتی۔ یہ سمجھوتہ نہیں تو اور کیا ہے، ہاں آج کی  
عورت خود کو کچل کے نہیں رہ سکتی۔ اخلاق کے ساتھ  
ہر ناخود کو پل پلیا رنے کے مترادف تھا۔ کوئی ایک  
بات ایسی نہیں تھی جس پر وہ مجھ سے متفق ہوتا۔  
کمرے کی کلرا سکیم، باٹھ روم میں رکھا شیپو، ناشتے  
میں کھائے جانے والے جیم کا برائڈ۔ اف ہر  
معاملے میں اپنی پسند ناپسند تھوپنا اس پر فرض تھا۔ اگر  
اسے اور نجماں ملید پسند نہیں تو کیا وہ میری خاطر کھا  
نہیں سکتا تھا۔ اگر مجھے اسکائی بلیو کلر سے نفت ہے تو  
کیا وہ اس کلر کی شرٹس پہننا ترک نہیں کر سکتا تھا۔  
سب ہی کچھ میں کیوں کرتی۔ آخر کب تک اپنا ادل  
جلائی۔ اسے ہر ہفتے اسکائی بلیو شرٹ باقاعدگی سے پہنے  
دیکھ کر کرہتی رہتی۔

فرالی انڈہ سے سخت چڑھے مجھے اور وہ میرے  
سامنے بیٹھ کیسے میری فیلنگز کی رلی برابر رواکے بغیر  
دو دو فرالی انڈے کھا جاتا تھا۔ سوچو کتنا مشکل تھا  
کہ ستم رانے تو اپنالے صفا حبہ کو دیجڑا کے آنکھ سننے پر  
والا بس اس کا اپنا نفسیاتی مسئلہ تھا۔ ایسے بیوی جانہ ہے  
بلار کھا سے۔“ غفور! صرف باتیں ہی بگھاریں یا مہمان کو چائے  
وغیرہ بڑی بیوچھی۔ وہی نئے تمہرے امداد اتوڑیں ملیتیں سزاں  
”ٹھنڈا منڈا تو پلا دیا۔ چائے کہ اس لیے میں بولا  
میرے لیے اس کے ساتھ رہنا۔ اور وہ سیٹھے باٹلی  
والا بس اس کا اپنا نفسیاتی مسئلہ تھا۔ ایسے بیوی جانہ ہے  
بلار کھا سے۔“

”تھی۔ پہلی سیٹھانی، ہر سال ایک بچہ پیدا کرنے  
والی ایسے دن بھر کھرداری میں ابھی رہنے والی، شامِ بن  
ٹھن کر سیروں سونالار کر اس کے ساتھ یار شیر میں جا کر  
ٹھن بھار بھار بنے والی۔ میں نے اس کے لیے یہاں  
تک لیا کہ دھانی سالوں میں دوبیٹے تک پیدا کیے۔

”یکن جی! میں اس کی پسند کے بھاری بھاری  
زیورات نہیں پہنچتی تھی۔ تو سڑا وہ میری شاعری کا  
میری صلاحیتوں کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ میرے فن کی  
قدرت میں تھی اسے، اس لیے میں نے الگ ہو جانا  
مناسب سمجھا۔ وہ اولاد جمع کرنے کا شوقین، اس نے  
بیٹھے اپنے پاس رکھ لیے، سب سمجھتے تھے کہ میں کھر  
بانے والی عورت ہی نہیں، حتیٰ کہ میرے اپنے ماں  
باپ بھی آپ بتائیے فلک جی! ہمیں ایسی ہوں؟“ اس  
نے اتنے ماں سے سوال کیا کہ میں نے بغیر سوچے  
سمجھے نہیں میں سرہلا دیا۔

”اب آغا غفور کے ساتھ بھی تو گزارا کر رہی ہوں۔  
بھی جہاں تک چھوٹے موٹے سمجھوتوں کا تعلق ہے  
ان سے میں نہیں گھراتی۔ آخر ہوں تو ایک مشقی لڑکی  
اپنی تمام تر وشن خیالی اور آزادی پسند فطرت کے  
باوجود۔“ اگر کچھ دری قبل میں اس کا بغیر میک اپ کا چھوڑ  
نہ دیکھے چکا ہو تو شاید اس کا خود کو لڑکی کہنا آسانی سے  
ہضم کر جاتا لیکن اس وقت اس کا یہ دعا میرے حلق  
میں اٹک گیا۔

”آغا غفور کی کتنی باتیں ہیں جنہیں میں مل پہنچر  
رکھ کے جھیل رہی ہوں، آپ ہی بتائیے فلک جی! ہمیں  
آج کی عورت کا کیسی مقدر ہے کہ وہ اپنے اوپر صرف  
باوفا اور صابر ہونے کا نیک لگوانے رکھنے کے لیے صبر  
سے سب کچھ بروادشت کرتی جائے۔“

”گجالہ! نیبل لگ گئی ہے، مہمان کو کھانے پہلے  
او۔“ اچانک آغا غفور اپنی قدرتی ڈھیٹ مسکراہٹ  
کے ساتھ یہ پیغام لیے حاضر ہوا۔ ”غزالہ اپنے زریں  
فرمودات اس حد تک میرے اندر ٹھوٹس چکی تھی کہ  
اب مزید کچھ کھانے کی ضرورت نہ تھی۔ مگر ایک اچھے  
مہماں کی طرح میں غزالہ کی بستگت میں ڈائینگ کیل۔

تک چلا آیا جو واقعی ایک "ہل" ہی تھا۔

اخبارہ کرسیوں والی وہ گاس ناپ، براں میڈڈ انگ شبل انواع و اقسام کے کھانوں سے بھی ختم۔ بلکہ الی پڑی تھی۔ ایک نظر ڈال کر، میرا تو دل گھبرا سا گیا۔ تین چانینز، دو ایلین اور کم از کم چھ روائی تپڑ کلف دیکی دشمن کے علاوہ بازار سے منگائے آسم پہنی صاف پہچانے جا رہے تھے۔ مشلاً مٹن تک، چکن کباب اور پیزا اپنی نشت سنبھالتے ہوئے میں نے ایک اور تجھیب مظہر دیکھا۔ آغا غور اپنی پلیٹ ہاتھ میں تھامے غزالہ کے روپ مودبنا کھرا تھا۔ جو لف زدہ نہیں کھول کر اپنے آگے پھیلارہی تھی۔ ایک شان بے نیازی کے ساتھ جب اس نے اپنے شوہر کی پیش کردہ پلیٹ تھامی تو مجھے میاں یوی کی اس محبت پر رٹک سا ہوا یہ واقعی کیا آئندیں شوہر تھا۔ (کم از کم ایک یوی کی نظر میں) جو خود بھر کے پلیٹ پیش کر رہا تھا۔

"لاؤ بھئی" پہلے تمہارا کھانا ڈال دوں۔ "غزالہ کے کھنے پر مجھے مزید رٹک محسوس ہوا۔ یعنی اس میں بھی مشتعل یویوں والی ادا میں پائی جاتی ہیں، خود کچھ کھانے سے پہلے شوہر کی پلیٹ بھرنا، میں دیپسی سے یہ مظہر دیکھنے لگا۔ غزالہ نے پلیٹ کے ایک کونے میں فریش سلاو، کچھ رائستہ رکھا۔ پیغمبیر پاستاڈ والا۔ مٹن تک میں سے ایک لاگری چانپ متحب کی۔ اور باقی ماں دھنے پچھے کو ماش کی والی سے بھر دیا۔

"وگجالہ! تھوڑے سے چاول بھی۔" وہ لکھ کھیا یا۔

"تو نہ دیکھی ہے اپنی۔" وہ پھنکاری۔ "وزن تو ایسے بڑھتا جا رہا ہے جیسے عدنان سمیع سے شرط لگا کر کھی ہوئے۔ چاول نہ کلب نہ سویٹ دش۔"

"آغا صاحب کو شے صرف دش کر رہے۔ بلکہ سر اچھوٹے پچھے کیا کھانے میں کس لیے

کو لیسٹروں لیوں بھی لاست لمٹ کر رہا ہے۔ یہاں بیٹھے تو ندیدی نظروں سے ہر چیز کو تکتے رہیں گے۔" وہ استنزائیہ ہے۔

"نه آپ کو کچھ ہضم ہو گا نہ مجھے۔ ویسے بھی نلک جی! میں تھمری نفاست پسند شاعر، آپ تصور نہیں کر سکتے، اسے اپنے سامنے کھانا کھاتے دیکھ کر میری نفس طبع پر کیا قسم نوٹھے ہیں۔ اس کی "چپ" چپ۔" گر کے چبانے کی آوانسے اونسے ہو ریا۔

اس نے کراہیت سے منہ بنا یا تو میں تھرا اٹھا۔

اچانک مجھے کئی سال پہلے کا واقعہ یاد آیا۔ حالات ذرا بہتر ہوتے ہی میں نے تب آرزو کو ایک کل و قتی ادھیزر عمر ملازمہ رکھ کے دی تھی۔ جب دونوں اوپر تلے کے پچھے چھوٹے تھے۔ مای شتو کو جب پہلے دن آرزو نے آواز دے کر کھانے پر بلا یا تو میں نے خاص نوش نہ لیا۔ لیکن اب مجھے اس کی مزید صحبت کی خواہش رہی۔ میں نہ ہی اس کی ذہانت سے بھر بور خوبصورت گفتگو اکاف اندوڑ ہونے کی۔ میں جلد ہی معذرت کر کے اس سے اٹھ گیا۔

\* \* \*

"آگئے خیر سے۔" وہ آج بھی خربونوں سے مل اڑا ہی تھی۔ ایک نظر میرا چہرہ دیکھنے کے بعد وہ اپنے اپنے ہاتھ پوچھتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں روپی کرم کر لی ہوں۔"

"تمہیں پتا تو ہے کہ میں کھانے کی دعوت سے ہی، اہوں۔"

"رجہ پیٹ والوں کی ٹھکلی، ایسے بارہ نہیں بچے اتے۔" وہ ہاتھ اور سرخونوں بھفتی میرے دعوے کو اکافی۔ اور میں پہلے کی طرح اس کے درست ازے پہ تیچ و تل نہ کھاسکا۔ چند ہی منٹ بعد میرے سامنے تھی۔ آلو کا پر اٹھا، لوز ہے کا ہار زیرے والا رائستہ اور کالی مرچ والا کھیرا، میں کافی اس سے آلو کے پر اٹھے کی فرمائش کر رہا تھا جسے آرزو مل بے اختیاری سے در گزر کرتی آرہی تھی اور آج بکھر میں کھانے پہ موجود نہیں تھا۔ میری پسندیدہ چیز

ل آنرپ کا مل دکھا کر "ہا نہیں" لے لیا۔ اللہ معاف نہیں تھی۔ اس نا انصافی پر میں آواز بلند کیے بغیر نہ رہ اس وقت میرے سامنے بیٹھی وہ عورت۔

لے ہیں آپ نے ایک تو آلو یہے، ہی باغی کھانی میں نہ کاموازنا۔ بھی اپنی یوی جیسی ایور ٹچ عورت اسے نہیں تھی۔ اس نے کاموازنا کی ملائم کے ساتھ نہیں تھی۔ دوسرے آپ اچار بغیر پر اٹھا لیتے میں بلکہ اپنے شریک حیات کے ساتھ ایسا سلوک ہے۔ ہم نہیں۔ میرا کہا دلاغ خراب تھا، ساری رات آپ کھاتے تھے، میں جاگتی رہتی مفت کا تیباہ۔ میں کھایا جا سکتا۔ میں سکرایا تو وہ حیرت زدہ میرے نزدیک ہی بیٹھ گئی۔

"میں نے کھا۔ ابی! سنتے ہو؟"

"سن رہا ہوں۔" میں نے ختہ لذیذ پر اٹھے کے لئے سے لطف اندوڑ ہوتے ہوئے کھا۔

"بڑے اچھے موڑ میں لگ رہے ہو جی، لگتا ہے، وہاں خوب مزما آیا۔ بڑے بڑے لوگ ہوں گے، بڑی بڑی باتیں ہوں گی ان کی۔"

"ہاں لوگ تو بڑے تھے۔ مگر باتیں میں بڑیا کے رہ گیا۔ میری خود کلامی کو نہ بخھتھتے ہوئے وہ برتن اٹھا کے کچھ کی طرف مڑنے لگی۔

"آرزو! میں نے کھا، سنتی ہو۔؟"

"ہیں جی؟" وہ غش کھاتے کھاتے رہ گئی۔

"اس ویک اینڈیہ پر گرام بنا، ہی ڈالو بندی جانے کا۔ بھائی جان کو فون کر کے بتا رہا تھا مگر وہاں پچھے پہلے سے تیاری کر کے رکھیں مرنی جانے کی۔"

"ہائے پچھی، کتنا سوار آئے گا، کتنا شغل ہے گا، ہائے میں مر جاؤں۔ پہلے جانال کو تو یہ خبر سناؤں۔"

اس کے چرے پر اس معمولی سی خبر سے یک بیک اتنی خوشیاں اور رنگ بکھر گئے کہ زندگی میں پہلی بار مجھے محسوس ہوا، خوشی کے اس سچے اور بے ساختہ رنگ کے آگے ساری شاعرانہ تراکتیں سب تختیلاں تی لاطائفیں سیچ ہیں۔ سراب ہیں۔

